عصمت چغتائی

ممتاز مفتی

منیب الرحمن

اگست ۱۹۴۶

ترتیب

جلد ۲۳ — شمارہ نمبر ۵

-/۸/-

نیا اردو ادب

مکتبہ اردو کی مطبوعات اُردو ادب کے ذخیرے میں گرانبہا اضافہ اور ہندوستان کی ذہنی ترقی میں سنگ میل ہیں۔ مکتبہ اردو ہندوستان کے نامور لکھنے والوں کی طرف دست تعاون بڑھاتا ہے۔ اور اُن کی فنی تخلیقات کا بہترین نعم البدل پیش کرتا ہے۔

تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
کمپنی کی حکومت	باری	۲/-/-
انقلاب فرانس	"	-/۸/-
تاریخ کیا ہے؟	"	-/۸/-
تاریخ یونان	جے - بی بیوری	-/۸/-
توزک بابری	ظہیر الدین بابر	-/۸/-
سلطنت روما	جے - بی بیوری	-/۸/-
انقلاب کی تاریخ	گوپال متل	-/۸/-
تاریخ عالم	باری	(زیر طبع)

سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
گورکی کی ڈائری	حسن عباس	-/۸/-
کارل مارکس	باری	۱/۴/-
استالین	مارشل وارشلوف	-/۸/-
ماتا ہری	خلیل احمد	(زیر طبع)
عصمت انونو	ثریا اندریمان	-/۸/-
محمد عربی	باری	-/۸/-
رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا	-/۸/-
ٹراٹسکی	نریندر ناتھ سیٹھ	-/۸/-
ہمارا لینن	ماٹل ملیح آبادی	-/۸/-
لینن (بحیثیت ایک انسان)	کلارا زٹکن	-/۸/-
سیرت امام ابن تیمیہ	غلام جیلانی برق	۲/۴/-
ہندوستان کے لیڈر	یوسف مہر علی	-/۸/-
سبھاش بوس	گوپال متل	-/۸/-
گاندھی	"	-/۸/-
جواہر لعل نہرو	"	-/۸/-
ابوالکلام آزاد	عبد اللہ بٹ	-/۸/-
تانیا	پی۔لیڈوف	-/۸/-
Aspects of Abul Kalam Azad		1-12
ٹالسٹائی	جیرلڈ ابراہم	-/۸/-
نپولین	ایچ۔اے۔ایل فشر	-/۸/-
میری زندگی	چیخوف	(زیر طبع)

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
نئے زاوئے (اول)	(مرتبہ) کرشن چندر	(زیر طبع)
نئے زاوئے (دوم)	(مرتبہ) کرشن چندر	۶/-/-
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	۴/-/-
رنگ و بو	سید فیاض محمود	(زیر طبع)
باسی پھول	علی عباس حسینی	۲/۸/-
طلسم خیال	کرشن چندر	۱/۱۲/-
ٹوٹے ہوئے تارے	"	۱/۱۲/-
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/-/-
کونپل	اپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
عورتوں کے افسانے	کوثر چاند پوری	۲/۸/-
دنیا کی حور	"	۱/۱۲/-
لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱/۸/-
پرواز لقلق	"	۱/۸/-
سرکش روحیں	خلیل جبران	۱/۸/-
پھول اور کانٹے	گوپال متل	-/۸/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۲/۱۲/-
بگولے	احمد ندیم قاسمی	۳/-/-
طلوع و غروب	"	۱/۱۲/-
۳ پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	۱/۸/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۳/-/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۲/۸/-
شبستان الم	زبیدہ سلطانہ	۲/۸/-
الاؤ	سہیل عظیم آبادی	۱/۸/-
ایک لڑکی	(خواجہ) احمد عباس	۱/۸/-
زندہ چین	(مترجمہ) تمنائی	۲/-
خونی	اختر انصاری	۱/۱۲/-
کرنیں	شفیق الرحمن	۲/-/-
ان کہی	ممتاز مفتی	۲/۸/-
کلیاں اور کانٹے	اختر اورینوی	۱/۱۲/-
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۲/-/-
چٹان	اپندر ناتھ اشک	۱/۱۲/-
پردہ سیمیں	ڈاکٹر محمد نصیرالدین	۳/-/-
چاند کا گناہ	راجہ مہدی علی خان	۳/-/-
جگا	بلونت سنگھ	۲/۱۲/-
بھنور	شیر محمد اختر	۱/۴/-
چاندی کے تار	مہندر ناتھ	۲/۱۲/-
پتھر کا دل	مترجمہ سراج الدین	۲/۱۲/-
ایک بات	عصمت چغتائی	۲/۸/-
ان داتا	کرشن چندر	۲/۸/-
درپن	شکیلہ اختر	۲/-/-
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری	۳/-
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	۳/-
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۲/۸/-
نئے دیوتا	دیوندر ستیارتھی	۳/-
زندگی کا میلہ	اخترحسین رائے پوری	(زیرطبع)
ناگن کالی رات	وقار انبالوی	"
جھمیلے	ممتاز مفتی	"
پت جھڑ	احمد ندیم قاسمی	"
جدید۔جدید تر	دھرم پرکاش آنند	"
بد تمیز	سعادت حسن منٹو	"
گائے جا ہندوستان	"	"

ادارہ

اشارات

ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ دوسری جنگِ عظیم باوجود اپنے ہنگامی ہیجان کے ایک دبے دبے سے آتش فشاں پہاڑ کے اجزا مرتب کر رہی تھی جو جنگ ختم ہوتے ہی کئی سمتوں سے لاوے کی طرح پھوٹ نکلے ہیں۔ انسانی سماج کے دوسرے پہلوؤں کی نسبت فنونِ لطیفہ ان لاووں کا زیادہ شکار ہو رہے ہیں ــــ مثال کے طور پر فلم آرٹ ہی کو لیجئے۔ یہ فن ہندوستان میں تازہ وارد سہی۔ لیکن اس کے دورِ متوسط میں ارتقائی مستقبل کی طرف رُخ کرتے ہوئے چند فلمی اداروں سے یہ اُمید بندھ گئی تھی۔ کہ شاید ارتقا کے اس آئینے میں اب کوئی بال نہیں آنے دیا جائے گا۔ بلکہ ہر نیا قدم ہندوستانی فلمسازی کی تاریخ میں نئے نئے راستے سجھانے کا حامل ہوتا رہے گا ــــ لیکن جنگِ عظیم کے ہیجانی دباؤ نے ترقی کے ایسے دھاروں کا رخ موڑ کر انہیں بھی 'وقتی مفاد کے حصول' کے راستے دکھانے شروع کئے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح جن میں سرمایہ دارانہ حرص و آز کی آگ "ہنگامی شعلہ" بنی ہوئی، جبر تلے کچلے جاتے ہوئے عوام کو جھلسے جا رہی تھی۔ فلمسازوں نے بھی ارتقا کے غیر منافع بخش تسلسل کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور "زر و پیہ" کی خوابناک اور بے ڈھب فراوانی کے ریلے میں عوام کے ترقی پسندانہ تقاضوں کو بہا دیا۔ اور ایسے غیر معیاری فلموں کی تخلیق کرتے رہے۔ جن کے ڈانڈے عوامی ذوقِ سلیم کی بجائے "فراوانیٔ زر" سے ملا دیئے گئے تھے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح اُردو لٹریچر میں عامیانہ اور سطحی کتابوں پر ہر بوالہوس کی حسن پرستی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا رہا۔ اور اس لیبل کو زائد تر ین سینے سے لگاتی رہیں۔

خاتمۂ جنگ پر ترقی پسندانہ تقاضے کسی نئی اور صحت مند کروٹ کا انتظار کر ہی رہے تھے۔ کہ بدعت کے ایک اور سانپ نے پھن اُٹھانا شروع کیا۔ "فراوانیٔ زر" ایک دوسری مگر خوفناک شکل میں فلم آرٹ کو اپنے وسیع و عریض دامن میں لپیٹنے لگی۔ دورانِ جنگ میں سرمایہ داری کے نمائندوں نے اپنے ازلی اور فطری نصب العین کو ان حاروں اور رنگبروں تک پھیلا لیا تھا۔ کہ ان کے گوداموں میں "زر" کی سمائی مشکل ہو گئی۔ نفع اندوزی کے خوگروں کے لئے اس وسعت اور پھیلاؤ کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا ــــ چنانچہ لاوے پھوٹے اور فلم آرٹ ان لاووں کی جھپٹوں میں آ گیا۔

اور آج کیفیت یہ ہے کہ جگڑے ہوئے مرثیہ گویوں اور "تدر زائد" کو "زائد نفع" پر آزمانے والے سرمایہ سازوں میں ایک بے نتیجہ اور غیر شعوری سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ اور ہر تازہ آفتاب کی کرنیں ایک نئے فلمساز ادارے کے قیام کا پیام لاتی ہیں۔ اور ان غیر شعوری سمجھوتوں میں آئے دن اضافے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان ہنگامی سمجھوتوں کے فریقین، ارتقا کے بدترین دشمن ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ کہ یہ لوگ ترقی پسندانہ نظریوں کو اپنے لئے زہرِ قاتل سمجھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ بعض ایسے فلمساز ادارے جن میں ترقی پسندانہ فنی عناصر نے اپنی روح شامل کر رکھی ہے۔ انہی سمجھوتوں کی تقلید میں بہے جا رہے ہیں۔ اور اسی طرح عوامی آرٹ سے دُور تر چلے جا رہے ہیں۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بالآخر فلمسازی کا یہ دَور اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرنے کا مرتکب ہو جائے گا۔ لیکن اس ارتکاب کے ظہور پذیر ہونے تک فلمساز قوتوں اور ترقی پذیر نظریوں کو جو داخلی اور خارجی اذیت اٹھانی پڑے گی۔ اس سے بچنے کے لئے ایسی ترقی پسند قوتوں کو اجتماعی اور زوردار شکلوں میں مقابلے پر آنا چاہیئے۔ جو اس اذیت ناک دور کو جلد سے جلد ختم کر دیں۔ تاکہ فلم آرٹ زیادہ سے زیادہ عوامیت کے قریب لایا جا سکے زیادہ سے زیادہ افادی صحت مند اور زندگی بخش بنایا جا سکے ۔

کواپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں چوہدری برکت علی پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف لاہور سے شائع کیا۔

یہ شگوفے

اداؔ بدایونی

یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
یہ شگوفے، یہ رسیلے سپنے

مُسکرائے تو حیا ٹوٹ پڑی
کسمسائے تو ادا پھوٹ پڑی
ان کے مکھڑے کی جنوں خیز تپک
ان کے لہجے کی فسوں ساز کھنک
اِن کی معصوم نگاہوں کی جھجک
یہ نزاکت، یہ لگاوٹ، یہ پھبن
یہ نہائے ہوئے شبنم میں بدن

آج سے پہلے نہ پہچان سکی
آج سے پہلے نہ کیوں جان سکی!

آج سے پہلے بھی پھوٹے ہونگے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے
یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
اسی شوخی، اِسی رعنائی سے
یہی لہجہ، یہی لہجے کی کھنک
یہ سجاوٹ، یہ سجاوٹ کی چمک
یہ نگاہیں، یہ نگاہوں کی جھجک
اسی معصومی و برنائی سے

شکوہ بیگانہ نگاہی کا لئے
شاخ میں پہلے بھی پھوٹے ہونگے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے!

ندامت

منیب الرحمٰن

خواب آور، کیف زا لمحوں میں بھی

میں نے دیکھا ہے ترا ناسورِ غم رستا ہوا

اور اُن کھوئی ہوئی سہمی ہوئی آنکھوں کی پہنائی میں اشکوں کا محیطِ بیکراں

جس کے آگے جرأتِ فکر و عمل لاچار ہے

آہ! کیا تو اپنی کاہش ہائے رفتہ کے عوض

راحتِ امروز و فردا مول لے سکتی نہیں؟

بھُول جا اب عہدِ ماضی بھُول جا

بھُول جا اپنی وفاؤں کو جنہیں تو رائگاں کھوتی رہی

بھُول جا اپنے پرستاروں کے درپردہ ستم

لوٹ آئے ہیں پھر ایامِ شباب

گر رہے ہیں پارہ پارہ ہوگے پردہ ہائے خواب

ہنس کہ تو نے زندگی کو پالیا ہے بے حجاب!!

ایمیلی برنز

طبقاتی کشمکش اور کارل مارکس

طبقاتی کش مکش ایسے طریقِ پیداوار سے وجود میں آتی ہے جس سے سماج مختلف طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ ان میں سے غلاموں مزارعوں اور مزدوروں کو تو عملِ پیداوار کا سارا کام کرنا پڑتا ہے اور آقاؤں جاگیرداروں اور کارخانہ داروں کی جماعت کوئی کام کئے بغیر پیداوار کا ایک حصّہ غصب کر جاتی ہے۔ لیکن ہر دور میں ان دو بڑی جماعتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتیں ہوتی ہیں۔ دورِ گزشتہ کے طریقِ پیداوار کی باقیات۔ جیسے ہندوستان کے والیانِ ریاست اور آج کل کے زرعی کسان یا بعہدِ جاگیرداری دور کے صنعتی کاریگر جو بعد میں آنے والی باقتدار سرمایہ دار جماعت کے پیشرو تھے۔

یہ طبقاتی کش مکش انسان کو پیداوار کے بلند تر درجہ تک پہنچنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ جب کوئی کامیاب انقلاب ہوتا ہے۔ تو ایک بہتر طریقِ پیداوار وجود میں آتا ہے۔ یا اگر وہ پہلے سے موجود ہو تو اسے فروغ حاصل ہوتا ہے۔ برطانیہ میں سرمایہ کا رستہ کرامویل اور ۱۶۸۹ء کے شاندار انقلاب نے صاف کیا۔ یہی خدمت ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب اور دوسرے انقلابوں نے سرانجام دی۔ لیکن مارکس صرف ایک عمومی انداز میں حقائق کو بیان کر کے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ اُس نے اپنے وقت کی کش مکش اور جدوجہد کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا تاکہ وہ طبقاتی کشمکش کے اصول دریافت کر سکے۔

مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ سماجی ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان مختلف طبقوں کی جماعتی قوت کا تجزیہ نہایت اہم ہے۔ جو اس تحریک میں حصّہ لیتے ہیں جس سے ایک نیا طریقِ پیداوار وجود میں آتا ہے

یورپی ممالک کے ۱۸۴۸ء کے بہت سے انقلابی واقعات کا تجزیہ کر کے مارکس نے یہ ثابت کر دیا کہ چند ایک اصول ایسے ہیں جو ان تمام میں مشترک ہیں۔ وہ کونسی عمومی خصوصیات ہیں جو ان سب میں نمایاں ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انقلابی جنگ میں سب سے آگے ہمیشہ وہ طبقہ ہوتا ہے جو نئے نظامِ پیداوار میں زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر رہا ہو۔ لیکن وہ طبقہ اکیلے ہی یہ جنگ نہیں لڑتا۔ مثلاً ۱۷۸۹ء میں ابھرتی ہوئی سرمایہ دار جماعت کے دوش بدوش وہ کسان بھی تھے جو جاگیرداری دور میں پیداوار کا بار ہیبے کا ندھوں پر اٹھائے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے تاجر، خود مختار کاریگر اور نئے والی مزدور جماعت کے کچھ لوگ۔ آبادی کے ان تمام طبقوں نے پرانے نظام کی حاکم جماعت کے خلاف انقلابی جنگ میں حصّہ لیا کیوں؟ اس لئے کہ اختلافِ مفاد کے باوجود وہ یہ بھی بھانپ چکے کہ پرانے نظام کا وجود مسلسل تشدد اور ہر لحظہ بڑھتی مصیبتوں کا باعث ہے

یہی صورتِ حالات یورپ کے دوسرے انقلابوں کی تھی۔ جنہوں نے کچھ مدت بعد جاگیرداروں کی مطلق العنان بادشاہت کا خاتمہ اور سرمایہ داری کا رستہ صاف کیا۔ سوسائٹی کے باقی تمام طبقات حاکم طبقہ کے خلاف ایک ہو گئے تھے۔ نوزائیدہ سرمایہ دار طبقہ ان انقلابوں کا رہنما تھا۔ جنگ کے دوران میں۔ خاص طور پر ان ممالک میں جہاں مزدور جماعتیں کافی نشوونما پا چکی تھیں، نئے نئے اتحاد اور عہد و پیمان ہوئے۔ مزدور طبقہ نے جو اس جنگ میں اپنے مخصوص مفاد کیلئے شامل ہوا تھا کچھ ایسی مانگیں پیش کیں جنہیں سرمایہ دار طبقہ منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر مزدوروں کی

مانگیں منوانے کے لئے دباؤ ڈالتے اور سرمایہ دار ان کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لئے رجعت پسند طبقوں سے رجوع کرتے۔ تقریباً یہی صورتِ حالات کرمویل کے زمانہ میں پیش آئی اور فرانس میں ۱۸۴۸ء تک بار بار یہی ہوتا رہا۔ جون ۱۸۴۸ء میں پیرس کے مزدوروں نے اپنے نو تحصیل حقوق کی حفاظت کرنا چاہی۔ گو نئی سرمایہ دار حکومت نے جو فروری میں قائم ہوئی تھی اس وقت ان کو دبا دیا لیکن اس واقعہ سے مارکس اس حتمی نتیجہ پر پہنچا کہ پیرس کا مزدور طبقہ اس قدر قوت حاصل کر چکا ہے کہ آنے والے انقلاب میں وہ صرف سرمایہ داروں کا پیرو نہیں ہوگا۔ بلکہ رہبری کریگا ۱۸۷۱ء میں ایسا ہو کر رہا۔ پیرس کے مزدوروں نے کمیون (اشتراکی انداز کے ادارے) قائم کرلئے اور پھر دس ہفتوں تک پیرس پر قابض رہے لیکن صرف اس بات سے پہلی دفعہ مزدور جماعت نے انقلاب کی رہنمائی کی یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس جنگ میں بے یار و مددگار تھے وہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت کے خلاف اٹھے تھے جنہوں نے فرانس کو جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ اور خود ملک کی شکستوں، اور پیرس کے عوام کو بھوکوں مار کر اپنی جیبیں بھرنے میں مصروف تھے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف اس جنگ میں مزدوروں کے ہمراہ چھوٹے دکاندار تھے جنہیں سخت خطرہ تھا کہ قرضوں اور لگان کی منسوخی سے حکومت کا انکار ان کو تباہ کر دیگا تمام جماعتوں کے محبِ وطن تھے جو جنگ میں جرمنی کی فتح اور حکومت کے منظور شدہ عہدنامہ کی شرائط سے بددل ہو چکے تھے یہاں تک کہ ری پبلکن سرمایہ دار بھی جنہیں خدشہ تھا کہ گورنمنٹ کہیں پھر بادشاہت قائم نہ کردے۔ ان کے ساتھ تھے۔ مزدوروں کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ انہوں نے زرعی آبادی کو ساتھ ملانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر حقیقی انقلاب جس کا مقصد اس وقت کے حاکم طبقہ کا تختہ الٹنا ہو محض اسی ایک جماعت کا انقلاب نہیں ہوتا جس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیا ہو بلکہ ان تمام طبقوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ جو اس نظام میں کچلی جا رہی ہوں اور پابندیوں میں جکڑی ہوں۔ ترقی کی ایک مخصوص منزل پر جاگیردارانہ بادشاہت اور مذہبی خداؤں کے خلاف انقلاب کی رہنمائی سرمایہ دار طبقہ کرتا ہے۔ لیکن مزدور طبقہ تقویت حاصل کر کے انقلاب کی رہنمائی کے فرائض خود سنبھال لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ بتاتی ہے کہ ہر انقلاب میں عوام کے بہت بڑے گروہ مشترک دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بناتے ہیں، بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف اشتراکی انقلاب میں نئی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ اس متحدہ محاذ کی رہنمائی مزدور طبقہ کرتا ہے۔

پیداوار میں اختلافِ مفاد کی وجہ سے مختلف طبقات میں ایک مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ انقلاب جو ایک نئے طبقہ کو اختیارات سونپ دیتا ہے تاکہ ایک نیا طریق پیداوار وجود میں آسکے۔ اسی مسلسل کشمکش کی ایک منزل ہے صنعتی سرمایہ داری کے دورِ آغاز میں جماعتی جدوجہد میں کوئی اشتراکِ عمل اور کوئی تسلسل نہیں ہوتا۔ یہ جدوجہد تمام تر یا تو کسی کارخانہ میں اُجرتوں یا مزدوروں کی بدحالی جیسے مسئلوں سے متعلق ہوتی ہے۔" لیکن صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ۔ پرولتاری (مزدور طبقہ) نہ صرف تعداد میں بڑھتا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ متحد ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت بڑھتی ہے اور انہیں اپنی اس بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس بھی ہوتا ہے"۔ (کمیونسٹ مینی فیسٹو ۱۸۴۸ء) مزدور ٹریڈ یونین قائم کرتے ہیں جو ترقی کر کے بہت بڑی جماعتیں بن جاتی ہیں۔ اور اس قابل ہو جاتی ہیں کہ اس جنگ کو قومی پیمانہ پر چلا سکیں۔ وہ اپنے گاہگانہ مفاد کی حفاظت کے لیے انجمن امداد باہمی قائم کرتے ہیں اور پھر ترقی کی ایک مخصوص منزل پر پہنچ کر وہ اپنی سیاسی جماعت قائم کرتے ہیں جو ان کے جماعتی مفاد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور ان کے حقوق کی خاطر لڑتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جنگ آخر لڑی کس طرح جاتی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ مزدوروں کی اس سیاسی جماعت کے دو مقصد ہوتے ہیں (۱) ایسے انقلاب کی تیاری اور تنظیم جو

سرمایہ دار حاکم جماعت کا تختہ الٹ سکے اور (۲)۔ سوشلزم یعنی ایک نئے طریقِ پیداوار کا قیام۔

تیاری کے عمل کا ایک جزو مزدور جماعتوں اور خاص طور پر ٹریڈ یونینوں کے قیام میں مدد دینا ہے تاکہ مزدور طبقہ کی قوت بڑھے اور انہیں اس قوت کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو۔ اس کے علاوہ مزدوروں کے مختلف فرقوں کو ان کے فوری مقاصد کے حصول مثلاً زیادہ اُجرت اور بہتر حالات کے لئے ان کی جدوجہد میں مدد دینا بھی اسی تیاری کا ایک جزو ہے۔ اس جدوجہد کے ذریعے مزدوروں کو عموماً کچھ مراعات حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان مراعات کے تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ "اس جدوجہد کا اصل فائدہ اس کا فوری نتیجہ نہیں بلکہ مزدوروں کا ہر آن بڑھتا ہوا اتحاد ہے"۔ اس کے دوران میں مزدوروں کو اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ایک جماعت ہیں جن کا ایک مفاد ہے۔ اور یہ مفاد سرمایہ دار جماعت کے مفاد سے مختلف ہے۔ سیاسی پارٹی اس احساس کو تیز تر کرتی ہے۔ اور مزدوروں کو بتاتی ہے کہ کیوں جب تک سرمایہ دارانہ نظامِ پیداوار قائم ہے یہ جماعتی جنگیں جاری رہیں گی۔ اور کیوں اقتصادی بحران اور جنگیں مزدور طبقہ کو زیادہ سے زیادہ مصیبتوں سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ وہ انہیں مفصّل طور پر جتا دیتی ہے کہ یہ کشمکش اور جنگیں صرف نظامِ پیداوار کو بدلنے سے ہی ختم ہو سکتی ہیں۔ اور نظام اس وقت تک نہیں بدلا جا سکتا جب تک سرمایہ دار طبقہ کو بزور ختم نہ کیا جائے۔

ریاست کا تصور بعض اوقات پارلیمان کی طرح کیا جاتا ہے لیکن مارکس نے ثابت کیا کہ ریاست کے "تاریخی ارتقا کا نمائندہ اداروں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ بلکہ اس کے اُلٹ ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعہ حاکم طبقہ باقی آبادی پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ ابتدائی سماجی دور میں ریاست کا وجود نہ تھا۔ لیکن جب انسانی سماج طبقوں میں بٹ گئی تو مختلف طبقوں کے اختلافِ مفاد کی وجہ سے صاحبِ مراعات طبقہ کے لئے ایک ایسی فوج کے بغیر جو اس کے مفاد کی حفاظت کرے اور اس کے اشاروں پر چلے اپنے مراعات اور اقتدار کو قائم رکھنا ناممکن ہو گیا"۔ ایسی طاقت اب ہر ریاست میں موجود ہے۔ اس میں صرف مسلح فوج ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی قابلِ ذکر چیزیں شامل ہوتی ہیں جیلیں اور تشدد کے دوسرے ادارے"۔ اس طاقت کا کام ہمیشہ قائم شدہ نظام کی حفاظت ہوتا ہے یعنی قائم شدہ طبقاتی نظام اور طبقاتی مراعات کی حفاظت۔ اسے ہمیشہ "غیر جانبدار" اور سماج سے بلند تر ادارے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جس کا مقصد محض "امن و امان قائم رکھنا ہے"۔ لیکن امن و امان کا تحفظ قائم شدہ نظام کا تحفظ ہے اور بس۔ جب بھی نظام کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ طاقت حرکت میں آتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں یہ ریاستی مشین لوگوں کو "بغاوت" کے جرم میں گرفتار اور قید کرتی ہے۔ "باغی لٹریچر" کی روک تھام کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بظاہر یہ کام بڑے پُرامن طور پر کئے جاتے ہیں لیکن جب کبھی کوئی تحریک بڑے پیمانہ پر چل نکلتی ہے تو امن کا یہ ڈھونگ ختم ہو جاتا ہے۔ پولیس کھلے بندوں طاقت استعمال کرتی ہے۔ اور ضرورت پر فوج سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ دراصل ریاست طاقت کے اس آلہ کا نام ہے جو کم طاقتی کے مفاد کیلئے کام کرتا ہے۔

کیا ریاست پر پارلیمان یا دوسرے نمائندہ اداروں کا کنٹرول ہوتا ہے؟ جب تک تو یہ نمائندہ ادارے صرف حاکم طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ریاست پر ان کا کنٹرول رہ سکتا ہے۔ لیکن جب پارلیمان یا کوئی دوسرا ادارہ پورے طور پر حاکم طبقہ کی نمائندگی نہیں کرتا اور کوئی ایسا قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہے جو حاکم طبقہ کی برہمی کا باعث ہو سکے۔ اُس وقت یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا ریاست کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں۔ تاریخ میں ایسے بہت سے اداروں کا ذکر موجود ہے جنہوں نے حاکم طبقہ کے علاوہ کسی دوسرے طبقہ کے مفاد کی خیرخواہی کی کوشش کی اور انجام؟ یا تو انہیں ویسے ہی توڑ دیا گیا یا پھر بوقتِ ضرورت فوج نے انہیں مٹا دیا۔ کہیں بھی نیا اُبھرتا ہوا طبقہ محض پارلیمان میں ووٹوں کے بل بوتے پر پرانے نظام کو ختم نہیں کر پایا۔ اس کام کے لئے اُسے

ہمیشہ ریاست یعنی پرانے حاکم طبقہ کی فوجوں کے مقابلہ میں اپنی نئی فوجیں لانا پڑیں۔ کرامویل کے وقت کا انگلستان اس کا تاریخی ثبوت ہے ؛

مارکس صاف دیکھ چکا تھا کہ رائے دہندگی کے حقوق کی وسعت صورتِ حالات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کرتی۔ اصل طاقت اس طبقہ کے ہاتھ میں رہتی ہے جو نظام پیداوار میں برسرِ اقتدار ہو۔ وہ ریاستی مشین کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے خواہ نمائندہ اداروں میں کوئی تبدیلی ہوتی رہے۔ اصلی اقتدار کی حقیقی تبدیلی اسی وقت ہو سکتی ہے جب پرانی ریاست کی طاقت کے خلاف طاقت استعمال کی جائے، کیونکہ جو طبقہ بھی نظام کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے ریاست کی پوری طاقت اس کے خلاف عمل میں لائی جاتی ہے ؛

مارکس کے اس نظریہ کی تائید تازہ تاریخی واقعات سے بھی ہوتی ہے۔ فسطائیت کا بنیادی مقصد ہی مسلح طاقت سے تمام نمائندہ اداروں کا خاتمہ ہے۔ محض یہ اتفاق کہ فسطائیت پرانی ریاستی مشین کا بعینہٖ چربہ نہیں۔ بلکہ ایک نئی قسم کی تنظیم ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو بدلنے سے قاصر ہے۔ سپین میں آئینی طور پر منتخب پارلیمانی حکومت کے خلاف فرانکو کی بغاوت صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ نمائندہ اداروں کا ریاستی مشین پر کوئی اختیار نہیں ؛

سوال یہ ہے کہ حاکم طبقہ ریاستی مشین پر اور خاص طور پر فوج پر اپنا جداگانہ اختیار آخر قائم کس طرح رکھتا ہے۔ بظاہر تو پارلیمان کے کنٹرول میں ہوتی ہیں اور آئینی پوزیشن بھی یہی ہے؛ اس کا جواب ہمیں اس ریاستی مشین کی مخصوص ترکیب میں مل سکتا ہے۔ ہر ملک میں فوج، منصفی اور انتظامیہ محکموں کے تمام بڑے بڑے عہدے حاکم طبقہ کے قابلِ اعتماد خادموں سے پُر کئے جاتے ہیں۔ بھرتی اور ترقی کا طریقہ اس بات کا ضامن ہے۔ نمائندہ اداروں میں جمہوریت خواہ کتنا ہی نفوذ کر جائے ریاستی مشین کی فولادی جلد میں اس کا گزر جانا ناممکن ہے۔

جب تک تو کوئی نازک صورتِ حالات پیدا نہیں ہوتی یہ حقیقت جو کہ ریاستی مشین جمہوری پارلیمان کے قبضہ و اختیار سے باہر رہے پوشیدہ رہتی ہے لیکن کسی نازک صورتِ حالات میں یہ فریب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ خود برطانیہ میں سنہ ۱۹۱۴ء میں کیورہ کے مقام پر فوج میں بغاوت ہو گئی۔ آئرش ہوم رول ایکٹ کے خلاف رجعت پسندوں کی بغاوت کا خدشہ تھا۔ لیکن فوجی افسروں نے شمالی آئرلینڈ کی قلعہ بندی کرنے کا حکم ماننے سے انکار کر دیا!

جب ریاستی مشین محض قائم شدہ اقتدار کی حفاظت کا کام ہی سرانجام دیتی ہے تو اس کے خلاف کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تو اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ خواہ کتنے ہی نمائندہ ادارے قائم کیوں نہ ہوں جب تک اس ریاستی مشین کو ختم نہ کیا جائے۔ پیداوار میں کسی بہتر منزل پر پہنچنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ؛

اس کے باوجود مارکس ہمیشہ نمائندہ اداروں کا حامی رہا۔ وہ انہیں تاریخی طور پر جماعتی جنگ کا ایک معرکہ، ایک میدانِ کارزار سمجھتا تھا۔ جس طرح چارلس کے زمانہ میں پارلیمان ابھرتی ہوئی سرمایہ دار جماعت کے لئے سٹیج کا کام دیتی تھی جس کے ذریعہ اس جماعت نے مراعات حاصل کیں اور ساتھ ہی ساتھ جاگیردارانہ بادشاہت کے خلاف جنگ کے لئے لوگوں کو اکسایا۔ اسی طرح آجکل کی پارلیمان بھی مراعات حاصل کرنے اور مزدوروں کو آخری اشتراکی جنگ کیلئے اکسانے میں آلۂ کار ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا پارلیمان جمہوریت کے حصول کی جدوجہد بے معنی نہیں۔ گو یہ اصلی جنگ کا ایک جزو ہے اور فی النفس نیا سماج وجود میں لانے سے قاصر (یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ فسطائی ہر جگہ پارلیمان ادارے ختم کر رہی ہے کیونکہ یہ ادارے عوام کو ان کی مخالفت کا موقعہ بہم پہنچاتے ہیں) ؛

اسی وجہ سے مارکس نے پارلیمانی جمہوریت کے قیام کی جدوجہد کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ جس کا مقصد پچھلی صدی میں یورپ کی مختلف مطلق العنان حکومتوں کا مقابلہ کرنا اور جہاں ایسی حکومتیں ختم ہو چکی تھیں وہاں ان اداروں کے ذریعے عوام کو

زیادہ سے زیادہ حقوق دلوانا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی یقین تھا کہ جب تک ریاست پر سرمایہ داروں کا یا کسی ڈکٹیٹر کا قبضہ رہے گا اس وقت تک جمہوریت نہ تو محفوظ ہوسکتی ہے نہ مؤثر جس وقت مزدور طبقہ اس ریاستی مشین کو شکست دے کر پوری طرح ختم کردیگا اُس وقت ہی یہ حاکم کی حیثیت اختیار کرسکتے ہیں۔ اور جمہوریت کی جنگ میں فاتح ثابت ہوسکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عوام کا حکم اُسی وقت پوری طرح چل سکتا ہے جب ان کے رستہ کا سنگِ گراں یعنی سرمایہ دارانہ ریاستی مشین کا خاتمہ ہوجائے ۔

لیکن محض پہلے حاکم طبقہ کی ریاستی مشین کی شکست اور خاتمہ ہی کافی نہیں۔ مزدوروں کے لئے اس کی جگہ اپنی ریاستی مشین کا قیام ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ جماعت کی شکست کو اسی وقت شکستِ فاش بنانے اور نئے نظام کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ کرنے کے لئے انہیں اپنی طاقت کا یہ مرکزی آلہ وجود میں لانا ہے :

علاوہ ازیں انہیں اپنی طرز کی حکومت بھی قائم کرنا ہے۔ یہ حکومت سرمایہ داروں کی مروّجہ حکومت سے طرز میں بھی مختلف ہوگی۔ کیونکہ اس کا مقصد ہی مختلف ہے۔ مارکس پر یہ بات ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون کے تجربہ کے بعد واضح ہوگئی تھی۔ اس کمیونی حکومت کی خصوصیّت یہ تھی کہ یہ محض پارلیمانی ہی نہیں بلکہ ایک عملی طاقت تھی۔ اس کا کام بیک وقت قانون بنانا بھی تھا اور قانون پر عمل درآمد کرانا بھی۔ اس کے ممبروں کو ووٹر کسی وقت بھی علیحدہ کرسکتے تھے۔ کمیون کے ممبروں سے لیکر نیچے تک، پبلک سروس کی اُجرت ایک کاریگر کی اُجرت کے موافق تھی۔ مجسٹریٹ اور جج بھی انتخاب کئے جاتے تھے۔ اور رائے دہندگان انہیں برطرف برخاست کرسکتے تھے مستقل فوج کی جگہ قومی محافظ دستوں نے لے لی تھی اور اس میں مزدوروں کی اکثریت تھی۔ کمیون کی ان اور دوسری خصوصیّات کا مقصد یہ تھا کہ آلۂ حاکمیّت یعنی تشدّد اور طاقت کی مشین زیادہ سے زیادہ مزدوروں کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اور پرانی ریاستی مشین کے خلاف جس پر سرمایہ داروں کا قبضہ تھا یہ ریاستی مشین مزدوروں کے قبضۂ قدرت میں رہے۔ نئی طرز کی یہ حکومت جمہوری جنگ کی جیت تھی۔ اور اس کے ماتحت عوام اپنی زندگیوں کے زیادہ سے زیادہ مالک بن رہے تھے ۔

لیکن انگلز پیرس کمیون کی بابت لکھتا ہوا کہتا ہے۔ "یہ پرولتاری آمریت تھی"۔ تو کیا کمیون کی بابت مارکس کے اس بیان کہ "سرمایہ دارانہ پارلیمانی جمہوریّت کے مقابلہ میں اس طرز حکومت کے ماتحت جمہوری اختیارات بہت وسیع ہوچکے تھے"۔ اور اینگلز کے اس بیان میں کہ "یہ پرولتاری آمریت تھی"۔ کوئی تضاد ہے؟ نہیں! یہ بیانات ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت کی مرضی کے مطابق ایک نئی اور حقیقی طور پر جمہوری حکومت قائم کی گئی تھی۔ لیکن یہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق اُسی وقت کام کرسکتی تھی جب اسے کلّی اختیارات ہوتے۔ اور یہ اُس اقلیت کے خلاف طاقت استعمال کرسکتی جواب تک اپنی آمریّت کا کام کر سکتی تھی جب اسے کلّی اختیارات ہوتے۔ اور یہ اُس اقلیت کے خلاف طاقت استعمال کرسکتی جواب تک اپنی آمریت قائم کئے ہوئے تھی۔ اور اب بھی عوام کی مرضی کو پُورا ہونے سے روکنے کے لئے نہ صرف مالی ذرائع کو ہی تباہ کررہی تھی بلکہ مسلح مقابلہ بھی ۔

مارکس اور اینگلز نے جو تنائج ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون سے اخذ کئے تھے پرولتاری انقلاب کے بعد کے واقعات نے ان کی تصدیق کردی۔ روس میں ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں زار کے خلاف جدوجہد کو چلانے اور اس کی تنظیم کے لئے مزدور جماعتوں کے نمائندوں کی کونسلیں بنائی گئیں۔ اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں جب انقلابی حالات شباب پر تھے۔ سوویت (جو کونسل کیلئے روسی زبان کا لفظ ہے) قائم کئے گئے۔ لینن نے جانچ لیا تھا کہ پیرس کمیون کے بعد مزدور طبقہ کی بے پناہ ترقی کی وجہ سے مزدوروں کی نئی حکومت ان اداروں میں ڈھل کر ہی حکومت کا کام کاج چلا سکے گی۔ ان کونسلوں میں پہلے پہل صرف کارخانوں کے مزدوروں کے نمائندے ہی آتے تھے۔ لیکن جدوجہد کے

پہنچنے کے ساتھ ہی ان میں سپاہیوں اور کسانوں کے نمائندے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ تمام ڈیلیگیٹ مزدوروں کے نمائندے ہوتے تھے اور کسی وقت بھی وہ انہیں ممبری سے علیحدہ کر سکتے تھے۔ اس سے اس بات کا خدشہ جاتا رہا کہ سرمایہ دارانہ اثرات کہیں ان جماعتوں میں نفوذ نہ کر جائیں اور مزدوروں کا حقیقی مفاد محفوظ نہ رہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسی آمرانہ حکومت ہی سرانجام دے سکتی تھی جس کی بنیاد طاقت پر قائم ہو اور جو پرانے حاکم طبقہ کے سوویت دشمن اقدامات اور ریشہ دوانیوں کا سر کچل سکے ٭

۱۸۴۸ء کے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں جگہ مارکس نے پرولتاری آمریت کی ان جمہوری خصوصیات کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے "سب گزشتہ تاریخی تحریکیں یا اقلیتوں کی تحریکیں تھیں یا اقلیتوں کے مفاد کی نمائندہ۔ لیکن پرولتاری تحریک ایک بڑی اکثریت کی خود شناس آزاد تحریک ہے۔ اور بڑی اکثریت کے مفاد کی نمائندہ ہے ٭

جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مارکس کا کبھی یہ خیال نہیں تھا کہ پرولتاری انقلاب کی کامیابی تمام جماعتی کشمکش کو یک قلم ختم کر دیگی۔ برخلاف اس کے وہ اسے ایک ایسا نیا موڑ سمجھتا ہے۔ جہاں پہنچکر ریاست کی آلۂ کار طاقت مزدوروں کے خلاف ہونے کی بجائے ان کی حمایتی ہو جاتی ہے۔ لینن نے جنوری ۱۹۱۸ء کی سوویت کانگریس میں ایک واقع بیان کیا جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ ریل گاڑی میں تھا۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے جنہیں وہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ یک لخت ایک آدمی اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "تمہیں معلوم ہے یہ بوڑھی عورت کیسی انوکھی بات کر رہی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ اب ہمیں بندوق والے سپاہی سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں ایک دن جنگل میں ایندھن اکٹھا کر رہی تھی۔ وہاں ایک بندوق والا سپاہی آیا۔ اور میرا ایندھن چھین کر چلتا بننے کی بجائے اس نے مجھے اکٹھا کرنے میں مدد دی"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاقت کا آلہ اب مزدوروں کے خلاف ہونے کے ان کی مدد پر ہے۔ اور یہ اب صرف ان کے خلاف حرکت میں آئے گا۔ جو مزدوروں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔

مزدوروں کے طاقت حاصل کر لینے کے بعد بھی ایسے لوگ باقی رہتے ہیں جو ان کے دشمن ہیں۔ پرانے حاکم طبقہ کے افراد دوسرے

ممالک کے حاکم طبقہ سے مل کر جس قدر بھی فوج اکٹھا کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ اور مزدوروں کی حکومت سے جنگ جاری رکھتے ہیں۔ ۱۸۷۱ء کا پیرس کمیون اسی طرح ختم کیا گیا۔ جرمنی نے ہزاروں فرانسیسی جنگی قیدی رہا کئے تاکہ وہ پیرس کے نواح میں ورسیلز کے رجعت پسندوں کی مدد کر سکیں۔ رجعت پسند فوج نے کمیون کو شکست دی، پیرس پر قبضہ کیا + اور کمیون کے حامیوں کو وحشیانہ طور پر قتل کیا۔ ۱۹۱۸-۱۹۲۰ء میں روس میں سوویت حکومت کو نہ صرف زار کی حمائتی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا بلکہ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور دوسرے ملکوں کی حملہ آور فوجوں کا سامنا بھی۔ تاریخ مارکس کے اس قول کی تائید کرتی ہے کہ مزدور طبقہ کو فتح حاصل کرنے کے بہت عرصہ بعد بھی اپنی ریاستی تنظیم برقرار رکھنا پڑے گی۔ تاکہ اپنی حفاظت کر سکے۔ اور اس دوران میں جبکہ اشترا کی انداز سے دوبارہ تنظیم ہو رہی ہو کوئی اس کے اختیار کو چیلنج نہ کر سکے ٭

جماعتی جنگ اور ریاست کا موضوع ختم کرنے سے پیشتر اس عمل کے آخری نتیجہ کے متعلق مارکس کا نظریہ کا بیان بے جا نہ ہوگا۔ جب سماج ایسے طبقوں میں بٹ گئی جنکے طبقاتی مفاد پیداوار میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ تو جماعتی جنگ اور اس کے ساتھ حاکم طبقہ کے مفاد کی حفاظت کے لئے آمریت وجود میں آئے۔ جماعتی جنگ اور ریاست کا وجود اس وقت تک تاریخ میں قائم رہتا ہے جب تک سماج طبقوں میں بٹی رہتی ہے۔ آخر کار مزدور طبقہ اس لئے طاقت چھین لیتا ہے کہ اس سماجی تقسیم کو ختم کر سکے اور ایک ایسے نظامِ پیداوار کی تخلیق کر سکے جہاں کوئی ایسی جماعت نہ ہو جو دوسری جماعت کی محنت پر زندگی بسر کرے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ایسی غیر طبقاتی سماج وجود میں آتی ہے جہاں ہر فرد پورے سماج کی خدمت کرتا ہے۔ جب یہ عمل ایک کائناتی پیمانہ بن کر مکمل ہو جائے گا تو پھر کوئی طبقاتی تنازعہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ کوئی ایسی جماعت ہی نہ ہو گی جس کا مفاد دوسری جماعت سے ٹکرائے۔ اس وقت ریاست کی بھی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ کیونکہ ریاست تو آخر طاقت کا ایک ایسا آلہ ہی ہے جس سے ایک قسم کے مفاد کی دوسروں کے مقابلہ میں حفاظت کی جاتی ٭

٭ ہے۔ یوں ریاست خود ہی ناپید ہو جائیگی۔ ایک کے بعد دوسرے حلقہ میں اس کی ضرورت ختم ہوتی جائیگی۔ اور جو مرکزی مشین باقی رہے گی۔ اس کا مقصد پیداوار کی تنظیم اور تقسیم ہوگا۔ جیسا کہ انگلز کہتا ہے "انسانوں پر حکومت کی بجائے اشیا کا انتظام اور عمل پیداوار کی رہبری باقی رہ جائے گی" (ترجمہ)

عصمت چغتائی

لال چیونٹے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بوجھڑ کر پیڑوں پر سبز قمقمے ٹمٹمانے لگتے ہیں، دوپہریں سنسان اور اونگھتی ہوئی ہو جاتی ہیں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اُجڑی ہوئی دوپہر کو جب لو کے جھکڑ آتشیں بھوتوں کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سڑکیں بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑی اور خاک آلود ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان خس کی ٹٹیوں کی آڑ میں دبکے بیٹھے تھے میں چھپا چھپی آم کے درختوں کے نیچے سر اُٹھائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادھا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی غمگین اور رُوکھی نہ رہے۔ میری بادیہ پیمائی بے کار نہ گئی۔ اور آن کی آن میں دوپٹہ اُتار، میں جھاڑ جھنکاڑ ٹہنیوں میں ہرے ہرے قمقمے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو ......

اس سے قبل کہ میرے بھوکے دانت سبز چادر کو چاک کر کے مدہوش کُن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغِ بسمل کی طرح زمین پر تڑپتے ہوئے پایا

—— لال چیونٹے!

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چٹے پڑ گئے تھے۔ ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیانک چیونٹے کا لال لال سر یاقوت کی بوند کی طرح سیفٹی پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس نامے نوبہ میں دھڑ تو جھڑ گئے تھے۔ مگر توبہ کیجیے ٹھوڑیاں اُسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوتا تھا چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بیکار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم پٹی، پیپ، خون، چپچپاتے ہوئے مرہموں سے دست و گریباں رہنا پڑا۔ پکے آموں سے الگ ہاتھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ زندگی کے انجن نے جی بھر کر بھرتا بنا دیا ہے وہ دہکتی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفریتیت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اسی یاد کا واسطہ دے کر ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اُداس اور سنسان ہو جائیں۔ للہ بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا۔ جہاں یہ خونی درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں ...... وہ آپ بھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں ماشاءاللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں جو جلتی دوپہروں میں آموں کی تلاش میں لال چیونٹوں سے اُلجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤ پیچ میں اپنا ہی پیر کچل جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر دھرنا چاہیے۔ کون جانے یہ لال چیونٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہوں۔ اور کیا، کون جانے ہم از کم میں تو نہیں جانتی تھی۔ جبھی تو ایک اُداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بیکاری نے اُکسایا۔ اور میں بیتے ہوئے واقعہ کو بھول کر دوبارہ لال چیونٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یہ ہوئی کہ ایک تھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان ٹی - پی - اے - ڈی اور ٹینس کورٹس میں تہذیب اور انسانیت کا بے نظیر مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں بھٹکی ہوئی چھلپائی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی۔ کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آجائے تو یہ شام اتنی نیم مردہ

اور پریشان کُن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ میرے غصہ کا پارہ بھی اُونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما ہال کے آگے ڈرائیور نے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی بھُن گیا۔ وُہ اشوک کمار کی چٹخنی جیسی ٹھوڑی۔ مہتاب کے اُبلتے ہوئے ہونٹ۔ سوڑن لتا کا دق زدہ ڈھانچہ دینا کا پہلوانی بازو۔ توبہ میری ایسی کون خطا ہو گئی۔ جس کے جُرم میں یوں عذاب دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔

"ٹیکسی موڑو۔" میں نے بھلا کر ڈرائیور کو ڈانٹا۔ کونے پر موڑ لوٹتے لوٹتے بچ کر رُک گئی۔ سامنے ایک عجیب الخلقت اشتہار لگا تھا۔ "اَمر ہندوستان .... اکسلسیر ..... عوامی تھیٹر۔" ان تین چیزوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ بھلا اَمر ہندوستان کون شے ہے؟ ضرور کوئی بھوتوں کا قصّہ ہو گا۔ جی مجھے بھوتوں کے قصّے بہت پسند ہیں۔ پتہ نہیں کیوں! ضرور کسی ممّی کے افسانۂ عشق کا جھگڑا ہو گا۔ ورنہ حضرت ہندوستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہو گیا اور اب تو سڑ گل کر دوسرے ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندوستان تو بیشک بنجر ملک ہے۔ مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ میں زیادہ حیل وحجّت کی قائل نہیں۔ حُکمائے اعظم کے اِس بیان پر کہ ہندوستان مرچکا میں نے کبھی کا فاتحہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مر ہی گیا تو پھر واویلا سے کیا فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل مرحوم کی روح کو اور عذاب ہو گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس سڑاندی لاش کو چٹ پٹ دفن کر کے دھوم دھام کا تیجہ کیا جائے اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف مُنہ اُٹھا کر دل کو ڈھارس دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھئے نا کمبخت ملک کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ گو ویسے خود میں نے تو نہیں۔ مگر ہاں میرے پیارے ملک کے احمق جانثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا اور بھئی کیا میں بذاتِ خود بھگتتی تبھی کچھ ہوتا۔ ایسے کیا مجھ میں سُرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی سے پھٹاک سے ملک آزاد ہو جاتا۔ ارے بھئی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد ہونا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب لپیٹ میں آ جاتے۔ اور کیا، سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی کچھ اُمید ہو تو کوئی کچھ کرے بھی۔ ہاں نہیں تو، ویسے اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے بچے تو عمر جیل یعنی سرکاری نوکریاں ایک سرے سے نصیب سے غائب۔ بھئی نہ تو میں ایسی حماقتوں کی طرفدار اور نہ ہی قائل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا کیا ہرج ہے آج "اَمر ہندوستان" کا ڈھکوسلہ ہی چلے۔ ارے ایسا بھی کیا ڈرنا کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے ایکسلسیر! یعنی ولیسی ٹھرّا اور ایک دم تاج میں! کیا کچھ نہ معجون مرکب ہو گی! مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ میم صاحب دیکھنے میں تو خاصی ہیں پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

دروازے پر سے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سامنے دو چار بچے کھُچے گنجے حلیہ کے ہیولے منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین پھوہڑ قسم کی لڑکیاں پروگرام بیچ رہی تھیں۔ دمینتی کو تو میں صاف پہچان گئی۔ پرلے درجہ کی پگلی۔ ماشاءاللہ پوری آستین کا کُرتا گرمی کے زمانہ میں دانتوں سے نوچ کر نیم آستین بنا لیا جاتا ہے۔ کنارے ترپنے کی توفیق نہیں۔ اور چلی ہیں پروگرام بیچنے ارے ایسا ہی تھا تو پوپٹ والا کی لڑکیوں کو بلا لیا ہوتا۔ خدا قسم ٹامیوں تک کا پٹرا کر ڈالیں! بارہ آنے کا پروگرام پورے ایک روپیہ میں لے کر میں تو جلدی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کمبخت ایسی بُری عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر مُنہ اُتر گیا۔ بس یہ سمجھئے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکّا دکّا فلک کی ستائی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اہے یہ میں نے کیا حماقت کی، اس سے تو "بھگت بوڈانا" ہی دیکھ آتی۔ خیر کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں۔ کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رُک گئیں۔ سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھُپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری بادیہ پیمائی بیکار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر

والی کرسی پر تھا۔ اور میں اُس کے سگرٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط پردہ اُٹھا تو دو چار ملگجے کپڑے پہنے اُجڑے حلیہ کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ ووڈر۔ نہ جھم جھماتے کپڑے۔ بس مسلی ہوئی دھوتیاں اور ڈھیلے ڈھالے کُرتے۔ اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علیگڈھ کالج میں صبح ہی صبح گایا جاتا تھا۔ کیا سریلی اور لیٹی لیٹی لے ہوتی تھی۔ کہ گاتے ہی میں جمائیاں آنے لگتی تھیں اور روز یہی جی چاہتا تھا۔ کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکئے دے کر ہال ہی میں پڑ رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں نغمہ تیز ہوتا گیا دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھول ہی نہیں گئیں۔ بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جوتے مار مار کے منوایا جا رہا ہے کہ "ہندوستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے کہ ایک دفعہ کو بہرا کان بھی چیخ اُٹھے۔ بھلا ان اللہ کے بندوں سے کس نے کہا ہو گا۔ کہ اتنی گرمی کے زمانے میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھ دو کہ دماغ میں چر کے لگنے لگیں۔ اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ غریب راج ویسے ہی جذباتی ہے اُس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ پروگرام کا ورق اُلٹا۔

اندھیری گھپ اسٹیج پر لال لال بھوت اپنی پوری خباثت سے چھپٹا۔ نقارے کی چنگھاڑ سُن کر سارے ساز چونک اُٹھے۔ غرانے لگے۔ نفیری چیخ اُٹھی۔ اور ستار جھلانے لگے۔ سازوں کی فوج پکار پکار کر انسانوں کو پکارنے لگی۔ دم بھر میں جی دار چاروں طرف سے ننگی تلواریں چمکاتے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے امنڈ کر دشمن پر اُلٹ پڑے۔ ننگے قدموں سے بڑھتے ہوئے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے۔ وہ سب کے سب نشانہ باندھ کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے۔ مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے پردہ گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاحول ولاقوۃ تین آدمی تو تھے ہی اسٹیج پر اور وہ بھی ٹڈوں جیسے سوکھے مارے یہ میرے واہمہ نے انہیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیوں بنا لیا۔ اور تین ہی تو عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پھوئے پھوئے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دہک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھواں!

جی چاہا گھبرا کر بھاگوں! مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم کے دو ٹکڑے کر گئی تھیں۔ "بھاگ یہاں سے" پیر کہتے تھے۔

"ذرا ٹھیرو!" دل نے پکارا۔ ان اعضاء کی تو تو میں میں سے ہلکان ہو کر میں اور بھی سہم گئی۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا اور بالکل ہی لرز گئی۔ پردہ گر چکا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پرت پردوں سے اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک زہر میں بجھی ہوئی چمک تھی۔ اور ہزاروں ننگی تلواریں ناچ رہی تھیں۔ اُس کا سینہ بوجھل بادلوں کی طرح اُبل اُبل کر دب رہا تھا۔

"راج!" میں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر جلد ہی اُس بھونچال سے سہم کر میں دُور ہٹ گئی۔ "راج" میں نے پھر پکارا "کیا طبیعت خراب ہے۔" "نہیں تو۔" اُس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز کی دنیا سے واپس کھینچ کر کہا۔ "گھر چلو گے؟"

"نہیں..... اُس نے ڈانٹ بتائی۔ توبہ ہے۔ لعنت ایسے تماشہ پر کہ جی ہلکان ہو جائے" یہ اُلٹے ہاتھ پر شانتی تھا اور سامنے پریم..... میں ان سب کو جانتا ہوں۔" اُس نے فخریہ کہا گویا ان سب کو جاننا ہی مقصد زندگی ہو۔

"وہ سچن شنکر تھا اودے کا رشتے کا بھائی!"

"ارے وہ لمبو تڑا سا۔"

"وہ لمبو تڑا سا قطعی نہیں تھا" اے لو۔ راج بُرا مان گیا۔ "وہ بہت خوبصورت ہے" "مزہ ہو گا" میں نے جل کر کہا۔ "مگر اودے شنکر کا بھائی! خوب کماتا ہو گا!" "وہ کچھ بھی نہیں کماتا۔" "گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے۔" "چالیس روپیہ ملتے ہیں۔"

"روز؟..... تو اور کیا کسی کا سر لے گا۔"

"جی۔ روز نہیں، مہینہ بھر میں۔"

"ارے۔ اور اُس سے سنکر اسے کچھ نہیں کہتا؟"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی آہ یہ ہونہار یوں مٹی میں عاقبت رُلا رہے ہیں۔ ارے صاحب یہی تو وقت ہے۔ کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں۔ اس سے تو گھچو جہالج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے بس اسی کے ذریعہ ہزاروں کما رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وہ آتش فشانی کیفیت غائب کر کے مجسم شعر بنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سر تال پر پھدک رہی تھیں معلوم ہوتا تھا وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں بلکہ یہ میٹھے میٹھے سُر ان کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھائے جا رہی تھی۔ ننھی ننھی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رنگینیِ احساس کو ڈبو کے دے رہی تھیں۔ اور راج ۔۔۔؟

راج بے حس تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا وجود ناچ رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں تھرک رہی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا۔ کہ کہیں یہ عوامی جھمیلہ مجھے پسند نہ آجائے۔

"کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں" ختم ہونے پر میں نے پوچھا

"نوکر نہیں۔ یہی مالک ہیں۔"

"خیر ہوں گی" میں نے جل کر کہا "مگر چالیس روپیہ میں تو"

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا۔

مگر میں سوچتی رہی پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی تکونی بھینگی ہیروئین بھری پڑی ہے۔ اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا۔ جبھی تو ہندوستان اتنا غریب ہے۔ جدن بائی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے تو اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ، اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی۔ کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اُڑا لیا گیا ہے کس قدر دسترس ہے۔ اور وہ کمبخت طوطے کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مجھی کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخنیاں دے رہا ہے اور اب جسم کے پُرزے اُڑے اور اب اُڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ پست طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا۔"

"ہُنہ یہ بنوٹے ہے"۔ راج نے ایک لمبا سا لکچر پھر شروع کر دیا۔ اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے معلوم ہوتا ہے کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگالی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے۔

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی"؟

"یہ پریتی سرکار ہے"۔ راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا سٹ پریزنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وہ کون ہے؟" میں نے کیوپڈ جیسے گھنگھریالے سر اور مونالزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ روی داہے۔ اودے شنکر کا چھوٹا بھائی" اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار دو گھڑی بعد جھانجن سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے

چٹخارے - آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار - توبہ -

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی - میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال چیونٹے - مجھے احمق نہ سمجھئے میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں - پروگرام کا آخری حصّہ شروع ہوا - اختتام پر وہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں کچے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی - اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی - دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل و دماغ پر حملہ بول دیا - بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا - ہوائیں چاروں طرف سے غیر مرئی چانٹے گھومنے لگے - احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا - جونہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا - جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول کے غول بھاگے چلے آرہے ہوں -

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو - کتنی بھی اُداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو - زندگی کتنی بھی سُستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پُرامن بِل سے نہیں نکلتی -

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لئے آگاہ کردوں - اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھئے گا - اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا - دیکھئے وہ جو میں نے زمانۂ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں انہیں بھول جائیے - اب میری کایا پلٹ ہوگئی ہے - اور لوگوں کی فلاح و بہبودی ہی میرا دین و ایمان ہے لہٰذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکئے - ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے ورنہ وہی ہوگا - جو روس میں ہوا اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اُٹھا چکی ہیں اُٹھا رہی ہیں اور ابد تک اٹھاتی رہیں گی - اُٹھئے اور اُن مہذب قوموں کا ساتھ دیجئے - ورنہ یہ برسوں کی گھنی گھنائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا - یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے - عرشِ تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جارہے ہیں - علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے پھینکا جارہا ہے - یہ لال چیونٹے دبے پیر سر جھکائے دھاری دار نیز دل جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں - آنکھ بچی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالیں گے - یہی ناچ رنگ جو آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں - ایک دن تگنی کا ناچ نہ نچا دے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجئے گا - اس تماشہ کے خاتمہ پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے - اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے - دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانک دیئے جائیں اور اگر کوشش بھی کی گئی تو رہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی - یہ جو دو چار بچارے خوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں بھی نہ رہیں گے - وہی گاڑھا گزی باہر والے ہنسیں گے - وائٹ اوے کا کیا ہوگا؟ رینکن اور بھگو مل کہاں جائیں گے؟ اگر آپ یونہی ہوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے گا - دیکھئے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گذر رہے ہیں - ایسا نہ ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے -

گو یہ تو اطمینان ہے - کہ ان کی پہنچ اسکولوں میں نہیں - اور ہمارے بچے مزے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں - ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹپٹا - خشک کاغذی چینھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے - جو اتنا ردی چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے - مگر یہ نئی چال جو عوامی تھیٹر کی آڑ لے کر چل رہے ہیں - کافی دیر سے زیادہ خطرناک ہے - ذرا چھچھورا پن دیکھئے ان کا - تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بلاتے ہیں - اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولہ بنا کر نچانے لگتے ہیں - ذرا سوچئے رقص دیوتاؤں کی دین ہے - کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا کچومر بنانے کے لئے پست کیا جائے - امر ہندوستان میں صاحب ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے اور چٹکیوں میں ہندوستان کا سودا کر بیٹھے - حالانکہ میں نے آٹھویں جماعت

"ارے۔ اور اُس سے سنکر اسے کچھ نہیں کہتا۔"

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی آہ یہ ہونہار یوں مٹی میں عاقبت رُلا رہے ہیں۔ ارے صاحب یہی تو وقت ہے۔ کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں۔ اس سے تو لچھو مہاراج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے بس اسی کے ذریعہ ہزاروں کما رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وُہ آتش فشانی کیفیت غائب کر کے مجسم شعر بنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سرتال پر پھدک رہی تھیں معلوم ہوتا تھا وُہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں بلکہ یہ میٹھے میٹھے سُر ان کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھائے جا رہی تھی۔ ننھی ننھی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رنگینئ احساس کو ڈبو کے دے رہی تھیں۔ اور راج ——؟

راج بے حس تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا وجود ناچ رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں تھرک رہی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے ڈر لگنے لگا۔ کہ کہیں یہ عوامی جھمیلہ مجھے پسند نہ آجائے۔

"کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں۔" ختم ہونے پر میں نے پوچھا

"نوکر نہیں۔ یہی مالک ہیں۔"

"خیر ہوں گی۔" میں نے جل کر کہا۔ "مگر چالیس روپیہ ہیں تو۔"

اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا۔

مگر میں سوچتی رہی پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک سے ایک ٹیڑھی تکونی بھینگی ہیروئین بھری پڑی ہے۔ اور ایک سے ایک زیادہ کما رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا نظر آیا۔ جبھی تو ہندوستان اتنا غریب ہے۔ جدن بائی کو دیکھئے خدا کے فضل سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد "مقدس رقص" شروع ہوا۔ ارے تو اچھا بھلا رقص کا فن جانتے ہوئے یہ لوگ، اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی۔ کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے کس قدر دسترس ہے۔ اور وُہ کمبخت طوطے کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کوا اُٹھا اُٹھا کر پٹخنیاں دے رہا ہے اور اب جسم کے پُرزے اُڑے اور اب اُڑے۔

میں تو پختہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ پست طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک سرے سے مجھے راس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضیع اوقات سمجھتی ہوں۔

"یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا۔"

"ہُنہ یہ بنوٹے ہے۔" راج نے ایک لمبا سا لکچر پھر شروع کر دیا۔ اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے معلوم ہوتا ہے کلوا دھوبی نے گاندھی جی کی آنکھیں چرا کر لگالی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نغمہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ نچوڑ کر بھر رکھا ہے:

"یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی سی؟"

"یہ پریتی سرکار ہے۔" راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وُہ سونے کے بٹنوں کا سٹ پریذنٹ کرنا پڑے گا۔

"اور وُہ کون ہے؟" میں نے کیوپڈ جیسے گھنگھریالے سر اور مونالزا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ روی داہے۔ اودے شنکر کا چھوٹا بھائی" اور میں سوچنے لگی کہ اودے شنکر کا پورا خاندان کسی مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ ہر ساز سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی طبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں ستار دو گھڑی بعد جھانجن سے چھیڑ چھاڑ اور پھر بانسری سے

چٹخارے۔ آدمی ہے کہ سازوں کا جمعدار۔ توبہ۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال چیونٹے۔ مجھے احمق نہ سمجھئے میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں۔ پروگرام کا آخری حصّہ شروع ہوا۔ اختتام پر وہی بھولی بسری دہکتی ہوئی سنسان دوپہر جب میں کچے آموں کے لالچ میں پیڑ پر چڑھ گئی تھی۔ اپنی پوری ہولناک تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال چیونٹوں کی فوج نے دل ودماغ پر حملہ بول دیا۔ بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چبھے اور زہر پھیلتا چلا گیا۔ ہوائیں چاروں طرف سے غیر مرئی چانٹے گھومنے لگے۔ احساس پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا۔ جونہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا۔ جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے غول کے غول بھاگے چلے آ رہے ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو۔ کتنی بھی اُداسی اور تنہائی چھائی ہوئی ہو۔ زندگی کتنی بھی سُستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پُرامن بل سے نہیں نکلتی۔

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لئے آگاہ کردوں۔ اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھئے گا۔ اس سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔ دیکھئے وہ جو میں نے زمانۂ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں انہیں بھول جائیے۔ اب میری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کی فلاح و بہبودی ہی میرا دین و ایمان ہے لہٰذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گولیاں نکال پھینکئے۔ ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے ورنہ وہی ہوگا۔ جو روس میں ہوا اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اُٹھا چکی ہیں اُٹھا رہی ہیں اور ابد تک اُٹھاتی رہیں گی۔ اُٹھئے اور اُن مہذب قوموں کا ساتھ دیجئے۔ ورنہ یہ برسوں کی گھنی گھنائی تہذیب کا نظام ڈگمگا جائے گا۔ یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے۔ عرش تمدن کے کنگورے اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ علم و ہنر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے پھینکا جا رہا ہے۔ یہ لال چیونٹے دبے پیر سر جھکائے دھاری دار بزدل جیسے ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رینگ رہے ہیں۔ آنکھ بچی تو یہ غلیظ سڑکوں کے کیڑے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالیں گے۔ یہی ناچ رنگ جو آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں۔ ایک دن تگنی کا ناچ نہ نچا دے تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجئے گا۔ اس تماشہ کے خاتمہ پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جارجٹ اور مخمل خواب ہو جائیں گے۔ اور شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کپڑا کہاں سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانک دیئے جائیں؟ اور اگر کوشش بھی کی گئی تو رہی سہی شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ جو دو چار بچارے خوش پوش ملک اور قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں بھی نہ رہیں گے۔ وہی گاڑھا گزی باہر والے ہنسیں گے۔ وائیٹ اوے کا کیا ہوگا؟ رویسا ل اور بھگو ل کہاں جائیں گے؟ اگر آپ یونہی ہوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ دیکھئے یہ لال چیونٹے ابھی ایک باریک سی قطار میں گذر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گو یہ تو اطمینان ہے۔ کہ ان کی پہنچ اسکولوں میں نہیں۔ اور ہمارے بچے مزے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹپٹا۔ خشک کاغذی چیتھڑا جس کی اشاعت مست قلندر سے دس گنی کم ہے۔ جو اتنا ردی چھپتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو تو کالک چھوٹنے لگتی ہے۔ مگر یہ نئی چال جو عوامی تھیٹر کی آڑ لے کر چل رہے ہیں۔ کافی دیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھچھورا پن دیکھئے ان کا۔ تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بُلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز ہیولہ بنا کر نچانے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے رقص دیوتاؤں کی دودیا ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا گھومر بنانے کے لئے پست کیا جائے۔ امر ہندوستان میں صاف ان لوگوں نے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت سوداگر آئے اور چٹکیوں میں ہندوستان کا سوداگر بیٹھے۔ حالانکہ میں نے آٹھویں جماعت

میں صاف صاف پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً قسمیں دے دے کر ہندوستان اُن کے سر مڑھ دیا گیا۔ سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے، کہ یہ کتنی شریف اور راست باز قوم ہے۔ ہندوستان کی خاطر یہ لوگ کیا کیا دُکھ نہیں اُٹھاتے۔ حضور گورنر جنرل اپنا اچھا خاصہ ملک اُجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں یہ کیا کچھ کم ہے اور پھر پارٹیاں کھانے اور گوٹے کے ہار پہننے کے لئے کتنی کتنی دُور جانا پڑتا ہے۔ بیچاری ملکہ وکٹوریہ تو خود دلی تک آ گئیں۔ چیلوں کے بیٹھنے کے لئے اور اپنا مجسمہ تک لگوا دیا۔ اور اس سے زیادہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے گندی ملک کے لئے جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں۔ اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مر گئے۔ مگر کاہلوں سے اتنا نہ ہو سکا کہ کما کھاتے۔ اور تو اور سُنا ہے۔ ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے؟ بھئی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے۔ تو آپ کو بھوک لگے گی۔ کوآں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کوئیں کے پاس۔ اور وقت کی پابندی تو ہم ہندوستانیوں کو کبھی آئی اور نہ آئے گی۔ وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے۔ اور بھوک مر جانے سے آدمی آپ ہی مرے گا۔

اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جائیے گا۔ خواہ مخواہ ان لوگوں کی بدذاتی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی یہ حاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور اُن کے کلیجے میں آگ لگی۔ اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں ہی کو بدنام کرتی ہے لوگ اُنہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا اس ہزار کے نوٹوں والی بدمذاقی ہی میں سوائے کنگالی اور بھک منگوں کے اور کون پھنسا ہو گا۔ بیچاروں کو ہزار ہزار کے نوٹ چار چار تین تین سو میں بیچنا پڑے۔ ذرا حساب لگایئے تو معلوم ہو گا۔ کہ ایک کنگلے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔

اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندوستان میں گداگری کی لعنت ہے۔

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں۔ بزنس کی ہو تو کالے گورے کا پتہ چلے۔ یہ بزنس مذاق نہیں کہ اُٹھے اور ناچنے لگے۔ اکنومکس کے بارے میں الف کے نام لٹھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقیدیں کرنے! یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم ——— مانگ زیادہ۔ مانگ کم رسد کے پو بارے۔ ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کما سکتا ہے کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کما سکتا۔ صاحب! یہ تو بزنس کے گُر ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی۔ اجی یہی چاول بھوسے کے بھاؤ پھنکتا۔

اگر آپ یونہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان میں بھی وہی ہو گا۔ جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے خواہ آپ کو کتنی بھی سستی ستا رہی ہو۔ کام ضرور کرنا پڑے گا۔ آپ کے پیارے بچے یتیم خانوں میں چلے جائیں گے۔ اور بیوی سرکاری طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہو گا۔ چاہے پوچھ لیجئے بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال چیونٹے تہذیب اور تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ اُنہہ۔ پتہ نہیں بھئی یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ ہی کہتے ہیں کچھ ہو گا۔ جبھی تو دنیا کہتی ہے۔ بڑے بڑے لیڈر کہتے ہیں تو کیا خدانخواستہ مذاق کرتے ہیں۔

یہ میل کے قائل ہیں۔ صاف بات اس گھمس کی گرمی میں تو میں کسی سے ملنا حماقت سمجھتی ہوں۔ کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ! ذرا سوچئے اگر ایک موٹے سے بنئے میں ایک سوکھا مارا مسلمان گھول دیا جائے تو کتنا بڑا ڈھیر ہو جائے گا۔ ابل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چپچپاتے پسینے میں غرق ——— جی چاہتا ہے بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر ڈالیں۔ نہیں بھئی میں کچھ بیچ سے بہت

ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندو مسلمان کا جوڑ ہی کیا۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اللہ توبہ بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں۔ اس ٹھنڈے انجن میں بس بھاپ کی کسر ہے اگر غلطی سے پوری ہو گئی تو بس لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور یہ ہیبت ناک انجن اس جگمگاتی دنیا کو روندتا سرمست ہاتھی کی طرح دندناتا اللہ جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہٰذا ابھی وقت ہے جاگیئے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے کا مقابلہ کر ڈالیئے۔ اِن کے بِل معلوم کیجیئے اور تیز سے تیز فلِٹ کا نسخہ ایجاد کر کے استعمال کیجیئے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے اِن جراثیم کی تلاش میں آپ کو اچھے بھلے تندرست جسم چیرنا پڑیں گے ہزاروں ناموں اور کاموں کی آڑ میں چھپے یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں۔ تو کہیں ادب کی ٹٹی کی آڑ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے نرت اور سنگیت کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ تو کہیں پردۂ سیمیں کے نیچے سماج کے حق میں دیمک بن کر رینگ رہے ہیں۔

انہیں ڈھونڈھ نکالیئے۔ ہوشیاری سے نتھنے پھیلا کر سونگھیئے اِن کی بساند ملک کے کونے سے خود دوڑی آئے گی۔ اور بس ناک کی سیدھ میں دوڑ کر انہیں پکڑ لیجیئے اور پھر...... انجمنیں قائم کیجیئے، جلسے کیجیئے، لکچر دیجیئے، ریزولیوشن پاس کرائیے، اِن کے خلاف پروپگینڈے کا ایسا جال بچھائیے کہ قدم قدم پر مُنہ کے بل گریں، ان کے اخبار جلا دیجیئے، پریس بند کر دیجیئے، ان کی پیشانیوں پر سُرخ دہے سے بالشویک داغ دیجیئے، یہ سب بالشویک ہیں۔ گویا جانتے نہیں، ان کی تحریروں پہ دفعات لگایئے، مقدموں کے ذریعے پھنیاں دے کر پست کر ڈالیئے، تاج شاہی کی مدد سے کچہریوں میں گھسیٹیئے، اور یہ جہاں ملیں جب ملیں اِن کو تباہ کر دیجیئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام با اثر رؤسا، علماء دین اور سرکاری افسروں کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجیئے، ہال کے باہر پکٹنگ کیجیئے۔ اور اندر دنگا مچائیے، اسٹیج پر اینٹیں اور پتھر پھینکیئے اور اتنا اودھم مچائیے کہ طبل جنگ کی پکار وہیں یتیم مردہ ہو کر سسکنے لگے ورنہ یاد رکھیئے اگر یہ خونی گرج ایک بار ننھی پود کے کچے کانوں میں گونج گئی تو وہ اِسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور آج جو تلاطم میں نے راج کے سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا۔ وُہ ننگی تلواریں جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آنکھوں میں جگمگا اُٹھیں گی۔

میں آپ کو بتلائے دیتی ہوں کہ یہ بات ہنسی میں ٹالنے کی نہیں، ایسا نہ ہو کہ اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لٹکا دیں اور پھر ایک وقت ایسا آئے کہ آپ کو دست تاسف ملنا پڑے، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھلیان کر چکی ہوں گی اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہو گا۔ پھر اُس وقت آپ کتنا ہی پچتائیں، نادم ہوں، مجھے یاد کریں، میرا مجسمہ بنوا کر شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں کچھ بھی نہ ہو گا۔ کیونکہ دیکھئے اگر یہ لال چیونٹے موجودہ نظام کے جسم کو ایک دفعہ لپٹ گئے۔ تو اس جنم میں تو نہ چھوڑیں گے۔ اور پھر یہ بھیانک زخم کسی مرہم سے پُر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھانے پر تُل ہی جائے تو خبردار ٹکٹ ہرگز نہ خریدیے گا۔ اور نہ کسی کو خریدنے دیجیئے گا۔ ہاں اگر مُفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر پرتیی سرکار روپہلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی تھرکتی، اٹھلاتی آواز بنوبیے کی اتھاہ سمندر جیسی گہری گونجتی گرجتی اُبھرتی ڈوبتی تانیں، اور ریبا کی برساتی جھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی میٹھی میٹھی مرکیاں تھوڑی دیر کے لئے انسان کو....... لاحول ولا قوۃ میں پروگرام پسند کرتے کرتے بچی!

عبادت بریلوی

تجدید

تری آغوش میں سوئی ہوئی یہ کس کی خوشبو ہے ؟
جواب انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
عجب یہ خواب کا عالم ہے —— اس عالم میں بھی اُس کے جلو میں سیکڑوں دیپک درخشاں ہیں،
ہیں کس درجہ حسیں مہ جبیں تبسّم کی جو ہر لمحہ لبوں پر رقص کرتی ہیں.
یہ جاگ اُٹھے مگر ہر سمت تاریکی جو چھائی ہے.
اندھیری رات ہے —— تاریکیوں کے قہقہے گونجے ہوئے ہیں چارسو اندھی خلاؤں میں
سمندر کی جنوں انگیز سی بپھری ہوئی موجوں کی صورت، جیسے وہ چنگھاڑتی ہیں جب کبھی طوفان آتے ہیں.
مگر پھر بھی
تری آغوش میں اس کے تبسّم کی وہ لہریں اک نئی دنیا بسائے ہیں.
چراغِ نور روشن ہے،
یہ مانا اس اندھیرے میں وہ گھبراہٹ سی کچھ محسوس کرتا ہے
مگر وہ مسکراتا ہے —— اور اس کی مسکراہٹ سے
فضاؤں پر عجب حیرت کا عالم ہے.
زمیں کے دل میں دھڑکن ہے
تعالی اللہ اس کے حسن کا عالم!
کہ جیسے دور جنگل میں کہیں پر ایک دہقاں کا چراغِ نور افشاں ٹمٹماتا ہے
سیہ تاریک راتوں میں
کسی بھٹکے ہوئے راہی کو جو اکثر نشانِ منزلِ مقصود سے آگاہ کرتا ہے،
وہ خوشبو پھیلتی ہے، بڑھتی جاتی ہے،
مگر یہ دور تک پھیلی ہوئی، غم ریز تاریکی نہ جانے کیوں پریشاں ہے ؟
بھیانک تیرگی میں سرخیاں کیوں ملتی جاتی ہیں ؟
ہوائیں آندھیوں کے روپ میں کیوں جلوہ فرما ہیں ؟
یہ منظر دیکھ کر آغوش میں تیری عجب انداز سے انگڑائیاں لے کر
وہ خوشبو مسکراتی ہے
اور اس کی مسکراہٹ قہقہہ سا بنتی جاتی ہے!

جاوید اقبال

طمانچہ

"...... اور اس دعوتِ شب میں آپ کی شمولیت میرے لئے باعثِ مسرت و انبساط ہو گی۔ میں عرض کئے دیتا ہوں کہ میری جسمانی اور ذہنی ساخت انتہائی کمزور و ناتواں ہے۔ لہٰذا آپ کی طرف سے معذرت میرے لئے ایک حادثہ سے کم نہ ہو گی جس کو برداشت کرنا میری قوت و اختیار سے باہر ہے۔ آپ از راہِ کرم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شام تک غریب خانہ پر پہنچنے کی تکلیف گوارا فرمائیے۔ میں آپ کا یہ احسان تا دمِ مرگ فراموش نہ کروں گا۔ آپ کی اطلاع کے لئے مزید عرض کئے دیتا ہوں کہ میں نے چند ایک معزز حضرات کو بھی مدعو کیا ہوا ہے۔ اور آپ کے اپنے ماحول کی ویرانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں وثوق سے کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میں نے آپ کی تفریح و نشاط کے لئے ہر ممکن سامان بہم پہنچانے کی سعی کر رکھی ہے۔ لہٰذا آپ بے نیلِ مرام واپس نہ آئیں گے۔"

یہ ایک مکتوب کی الوداعی سطور تھیں جو مجھے تھوڑے دن ہوئے موصول ہوا تھا۔ میں ایسے دعوت ناموں سے فطرتاً مانوس نہیں ہوں۔ کیونکہ میری زندگی میں شاذ ہی ایسے اتفاقات آتے ہیں۔ جب کسی نے پیار اور محبت سے مجھے اپنے ہاں بلایا ہو۔ یہ خط میرے ذہن کی اجاڑ سی تاریکیوں میں اس ستارے کی طرح ٹوٹ کر نکل گیا جو اپنے پیچھے روشنی کی طویل لکیر چند لمحوں کے لئے چھوڑ جائے۔ مجھے اپنی میلی سی گرد آلود دیواروں پر قوسِ قزح سی رقص کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میری نس نس سے ایک نئی زندگی پھوٹ رہی تھی۔ جیسے مجھے کسی مسلسل بھیانک خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ یا کہیں دور مجھے امید کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی جھلک دکھائی دے جائے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج میری فطرت کا ایسا پہلو سیراب کیا جانے والا ہے جس کو برسوں سے کسی نے پانی نہیں دیا۔ اور جسے زرخیز دیکھنے والے ابتدائی مراحل میں ہی اسے خیرباد کہہ گئے ہیں۔

میرے اور میرے میزبان کے تعلقات سرسری اور پہلی منازل میں ہی تھے۔ گو ان ہر دو خاندانوں میں مراسلت نسلاً بعد نسلاً تجاوز کرتی مجھ تک چلی آئی تھی لیکن غالباً میری بے پروائی اور بے توجہی کی وجہ سے ہماری رسم و راہ اب صرف جان پہچان تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ اور گذشتہ چند سالوں کا خلا ہماری آپس میں روشناسی کو معدوم کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے تہیہ کیا کہ مٹے ہوئے نقوش از سرِ نو استوار کروں گا۔ میں نے سوچا کہ میزبان کے درِ دولت پر پہنچتے ہی اُسے اوروں سے ذرا دور کسی ویران سے تخلیے میں لے جاؤں گا۔ اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی نگاہوں میں اپنی نگاہیں ڈال کر کہوں گا "میں مجرم ہوں، خطاوار ہوں۔ میری غفلت سے درمیان میں ایک ہلکی سی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں سے میرے دل میں اتر جاؤ۔ تمہیں لق و دق بیاباں ہی دکھائی دے گا۔ میں تشنۂ محبت ہوں۔ باوجود اس کے کہ مجھے دنیا کی ہر شے میسر ہے۔ قدرت نے مجھے ہر آرام و آسائش سے مالامال کر رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس کی ستم ظریفی کا شکار ہوں۔ اور شکوہ کناں ہوں۔ میری طرف صرف ایک بار شفقت بھری نگاہوں میں آنسو بھر لاؤ۔ وہی میرے لئے گنجِ قارون ہوں گے میں تمہیں عقدِ ثریا سے بھی کہیں بلند آسمانوں پر بٹھا دوں گا۔ ایک دیوتا کی طرح تمہاری پرستش کروں گا۔ میں تو دھول میں اٹا ہوا تعویذ ہوں۔ مجھے اٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لو۔ مجھے تمہاری دولت سے سروکار نہیں، بلکہ تمہارے دل اور اس کی گہرائیوں سے سروکار ہے۔ اور میں حقیقی و روحانی خوشی کا متلاشی ہوں۔ جو نہ تو آج تک میں خرید سکا ہوں اور نہ مجھے میسر آئی ہے۔ میں تمہاری دہلیزوں پر بھٹکتا ہوا فقیر ہوں۔ اور تمہارے احساسات کے

دسترخوان سے چند باسی ٹکڑوں کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔"

نہ جانے میں کب تک اپنے تصورات کو مختلف سمتوں میں بھراتا رہا۔ جو مُردوں کی طرح میرے ذہن کے وسیع قبرستان سے اپنے کفنوں سمیت اُبھرتے چلے آرہے تھے۔ معاً مجھے اپنے دو رفیقوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جو میری طرح اس دعوتِ عظیم پر بلائے گئے تھے۔ اور میرے ارادے سے آگاہ ہونے کے لئے آئے تھے کہ میں اُن کے ساتھ چلوں گا یا نہیں۔ اُن میں سے ایک خوابوں کی دنیا میں بسنے والا مجبور سا رئیس زادہ تھا جس کو برازیل کی چائے بہت بھاتی تھی۔ اور جو اکثر ٹھنڈی آہیں بھر کر کہا کرتا تھا۔ اے کاش! میرے پاس اس قدر دولت ہو کہ ایک فلک بوس قصر تعمیر کر دا سکوں۔ جس کے ایوان بے انتہا وسیع ہوں کہ ایسے خوبصورت سامانوں سے آراستہ ہوں جن کو کسی شاہنشاہ تک نے بھی خواب میں نہ دیکھا ہو۔ دیواروں پر سفیدی کی بجائے جواہرات جگمگ کرتے ہوں۔ خوابگاہوں میں ریشم و زربفت کے انبار ہوں۔ صحنوں میں ہریاول کا متلاطم سمندر ہو۔ جس میں مختلف جگہوں پر خوشنما پھولوں کے جزیرے ہوں۔ ہر لمحہ ایک اداس سی مہک میرے قصر کا احاطہ کئے رکھے۔ طویل ستونوں پر چوڑے پتوں والی بیلیں رقاصہ کے جسم کی طرح لہراتی، بل کھاتی ہوئی اوپر تک پہنچ جائیں۔ ہر لحظہ ایوانوں سے پازیبوں کی ہلکی ہلکی جھنکار اُٹھے۔ نقرئی قہقہے فضا میں موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑیوں کی طرح بکھر جائیں۔ زرین وردیاں پہنے ہوئے خدمتگار کھلے سے آسمان پر سیاروں کی طرح گھومتے نظر آئیں۔ پھر تم لوگ میرے مہمان ہو اور جب آفتاب طلوع ہو تو عطروں میں بسی ہوئی نیم برہنہ کنیزیں اپنے پھول ایسے شگفتہ لب تمہارے لبوں پر رکھ کر تمہاری نیندوں کا طلسم توڑیں۔ اپنی مخروطی، لانبی اور رنج بستہ انگلیوں سے تمہارے رخساروں کو چھوئیں۔ اور جب تم جاگ اٹھو تو مسکراتی ہوئی۔ تمہارے سامنے پھلوں کی طشتریاں رکھ دیں۔"

میرا دوسرا ساتھی ایک شیریں زبان، حسن پرست مصور تھا۔ جسے قدرت کے پہلو میں کیف، مستی اور سُرور ہی کا گمان ہوتا تھا وہ اکثر اندھیری راتوں میں سیر کرتے کرتے رُک جایا کرتا۔ اور جب میں اس سے وجہ پُوچھتا۔ تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک آجایا کرتی۔ جیسے میں اندھیرے میں بھی نمایاں دیکھ لیتا تھا۔ کس جذبے سے وہ کہا کرتا کہ تاریکی میں ایک تسلسل ہے۔ ایک پیار ہے۔ تاریکی ماں کی گود ہے جس میں ہر انسان آرام کرنے کی خواہش سے اپنے اپنے مسکن کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اُس کے طرزِ ادا میں کچھ ایسی مٹھاس ہوتی کہ مجھے یہ ظلمت ماں کے ہاتھ کی طرح سہلاتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اور مجھے کھڑے کھڑے نیند سی آجاتی۔ زلزلے آئیں۔ یا طوفان اُمڈیں۔ بجلیاں چمکیں یا بادل گرجیں اسے ہر شے سُہانی معلوم ہوتی تھی۔ نہ تو اُسے بہار و خزاں میں امتیاز تھا اور نہ ہی اسے گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہریں یا سرمیوں کی دُھندلی راتوں میں فرق محسوس ہوتا تھا۔ وہ چہروں کی دلفریبی کا قائل نہ تھا۔ بلکہ اُسے جسم کا ہر عضو جاذب دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی ہر بات شہد کی طرح گداز ہوتی۔ میں نے آجتک کبھی اُسے چیخنے چلاتے یا شور مچاتے نہ سنا تھا۔ بھاری ابروؤں کے سایوں میں اس کی نگاہیں کسی نہ کسی طرح کی ویرانی میں حسن ضرور تلاش کر لیا کرتیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ اپنے نظریے کے مطابق اپنے آپ کو ایک ایسی شخصیت سمجھتا جس میں کسی قسم کی ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جو دوسروں کو اُس کی طرف متوجہ کر سکے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ دوسروں کی تعریف کرتا۔ مگر صرف اپنی ہی بدخوئی کرتا۔ لیکن شاید وہ اس سے قطعاً غافل تھا۔ کہ اُس کا دل گوشت پوست کا لوتھڑا ہی نہیں۔ بلکہ ان جواہرات کا بنا ہوا ہے جن کی روشنی اکثر اس کی نگاہوں سے نکل کر اُسے سمجھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا کرتی ہے۔

میں نے اپنے دونوں رفیقوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا کہ میں اُن کے ہمراہ چلنے پر رضامند ہوں۔ اب ایک اور مشکل پیش آئی کہ وہاں کس طرح پہنچا جائے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "کیا آپ صاحبان کو وہاں پہنچانے کے لئے ہوائی جہاز درکار ہوگا؟

بھئی! جس طرح روز سیر کرنے جاتے ہیں۔ اسی طرح چل دیں گے۔"
لیکن میرا حسن پرست دوست بولا۔ کہ ہمارے مشترکہ میزبان کا دولتکدہ انتہائی دُور ہے اور مجھ سے پیدل نہیں چلا جا سکتا کیوں نہ سائیکلوں پر چلیں۔ اس مشورے سے میرے دوسرے رفیق خوابوں کی دنیا میں بسنے والے رئیس زادے کے چہرے پر رنج والم کی گھٹائیں چھا گئیں "کہیں سے کسی موٹر کا بندوبست ہو جائے تو نہایت موزوں ہے ہمیں [illegible] احساس نہ ہو سواری کے بغیر ہم غیر اہم اور حقیر معلوم ہوں گے۔" اس نے نہایت اندوہ ناک لہجے میں یہ الفاظ کہے۔ اور لمحہ بھر کے لئے ہم سب حقیقت کو سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ "تو پھر سرے سے جاؤ ہی نہیں۔ میں نے تنگ آ کر کہا۔ مگر میرے شیریں زبان مصور دوست نے کہا۔ یہ تم نہیں بول رہے۔ بلکہ تمہاری نہاد ہی ایسی ہے یقین رکھو۔ تم اگر وہاں نہ گئے تو میزبان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہیں اوروں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔" اب ایک اور نوع کی خاموشی مسلط ہوئی۔ اور اسی خاموشی میں نہ جانے یہ کس طرح طے پا لیا گیا کہ ہم ضرور جائیں گے۔ اور موٹر پر ہی جائیں گے۔

وقت مقررہ پر ہم تینوں موٹر پر سوار اس کھنڈر سے نکلے۔ جو میری جائے سکونت ہے۔ رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ آسمان پر ستارے ہیروں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ جھلملاتے تھے تو یہ گمان ہوتا تھا۔ جیسے حمام سے نکلنے پر کسی دوشیزہ کی اندھیری زلفوں میں الجھے ہوئے پانی کے قطرے چمک رہے ہوں کبھی کبھی ہوا کا کوئی لطیف سا جھونکا درختوں کی چوٹیوں کو یوں ہلا کر نکل جاتا۔ گویا کسی مغنی کے اچھا سا شعر پڑھنے پر ہمہ تن گوش خلقت پل بھر کے لئے جھوم جائے۔ سردی کی وجہ سے سڑکیں سرِ شام ہی اداس [illegible] گئیں۔ ہر شے پر ایک غنودگی سی طاری تھی۔ ایک تھکاوٹ سی چھائی ہوئی تھی جیسے [illegible] سب کے آخری حصوں میں طوائفوں کے بالاخانوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ جب سازندے اپنے اپنے سازوں کو ٹھوڑیوں تلے دبائے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اور طوائف انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتی، بار بار اپنے ہاتھ کو غار کی طرح کھلے منہ پر رکھتی جمائیوں کا تانتا باندھ دیتی ہے۔ اور شراب سے مدہوش دولتمندوں کے خراٹوں کی آوازیں یوں نکلتی ہیں۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اور باہر سڑک ویران گھنگھروؤں کی جھنکاریں مفقود، مدبھری تانیں فنا ایک موت سی طاری ہو جاتی ہے جیسے زمین پر اس کے کوئی آثار ہی نہیں۔ یونہی اکا دکا شخص لڑکھڑاتا ہوا ان تنگ سی گلیوں میں "کھڑپ کھڑپ" کرتا گذرتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا کوئی زخمی ہرن کسی ویرانے میں پناہ کی تلاش کر رہا ہو۔ اس پر ایک مدہوش ایک تھکاوٹ ایک غنودگی سی مسلط تھی۔ لیکن نیند کا نام و نشان میلوں تک نظر نہ پڑتا تھا۔ رستہ بھر ہمیں کوئی نہ ملا۔ کوئی سواری ہمارے نزدیک سے نہ گذری۔ صرف پریشان اڑی اڑی سی دھند موٹر کی کھڑکیوں کے [illegible] سے ہمیں کبھی کبھار جھانک لیتی تھی۔ میرا حسن پرست رفیق بہت چوکنا ہو کر موٹر چلا رہا تھا۔ ہم تینوں اگلی نشست پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے کی جانب میں تھا اور درمیان میں میرا مجبور رئیس زادہ۔ رستہ بھر ہم نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ کوئی حرکت نہ کی۔ اس موت ایسے سکوت میں صرف موٹر کی آواز ہی گونج رہی تھی۔ اور اس کے آگے لگی ہوئی بتیوں کی روشنی دھند کی کثیف سی چادر میں الجھ کر رہ جاتی تھی۔ ہماری یہ مستقل خاموشی، ہمارے یہ مہیب اور دہشت ناک سے خدوخال کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ بنتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ موٹر اس بھیانک سی رات میں موٹر کی بجائے تقدیر معلوم ہوتی تھی جو ایسے الٹھیلے دانت نکالے نتھنے پھلائے شعلے برساتی ہم تینوں کو اپنی پیٹھ پر سوار کئے۔ ہوا میں ناچتی اڑائے لئے جا رہی تھی۔ اور ہم بے بس تھے۔ درخت اور بجلی کے کھمبے سائیں سائیں کرتے ہمارے پہلوؤں سے نکل رہے تھے۔ لوگوں کے مکان، کوٹھیاں، باغات، کتوں کی طرح چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو ہمارے ساتھ گھسیٹتے یا ہمارے برابر رہنے کی پوری کوشش کرتے۔ مگر پیچھے رہ جاتے۔ کئی موڑ آئے اور نکل گئے۔ کئی چوک

آئے اور گذر گئے ۔ موٹر دھند کو چیرتی ہوئی بڑھتی چلی گئی ۔ اور ہم اس ڈبہ میں مقید، اپنے اور اِرد گرد کی سب چیزوں سے بے خبر، دھند کو اپنے گذر جانے کے بعد پھر گھلتے دیکھتے گذرتے چلے جا رہے تھے ۔ جو ہمارے پیچھے آنے والوں کو ہمارے بارے میں گمراہ کرنے میں مدد دے رہی تھی ۔ اس مسلسل سی دوڑ میں ہمارا کوئی سراغ نہ لگا سکتا تھا ۔

تھوڑی دیر بعد دھند میں ایک عالی شان عمارت اُبھرتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ موٹر کی رفتار سُست ہو گئی ۔ اور ہم سب نے اپنی اپنی جگہ جان لیا کہ ہماری منزلِ مقصود آن پہنچی ہے ۔ یہ ایک محل سا تھا ۔ جس کے سامنے اور گرد کھلے باغات تھے ۔ پھاٹک کے اندر زمین سڑک کے مطابق ہموار نہ تھی بلکہ کچھ یونہی خفیف سی بلندی پر عمارت بنی ہوئی تھی لہٰذا اندر داخل ہونے والوں کے لئے اس ذرا سی بلندی کو عبور کرنا بھی ضروری تھا ۔ ممکن ہے اگر ہم پیدل ہوتے تو اسی ہلکی سی اونچائی پر چڑھنا ہمارے لئے دشوار ہو جاتا ۔ لیکن ہم تو موٹر پر تھے ۔ جس نے ہمیں اس خفیف سی بلندی کے احساس سے بے نیاز کر دیا تھا ۔ موٹر اندر چلی گئی ۔ وہاں اور بہت سی موٹریں جو ہماری موٹر سے ہزار درجہ بہتر تھیں چیونٹیوں کی ایک طویل قطار کی طرح کھڑی تھیں ۔ میرے شیریں زبان رفیق نے غیر ارادی طور پر اپنی موٹر کو اُس قطار میں کھڑا نہ کیا بلکہ الگ ٹھہرایا ۔ بہر حال مجھے اس کی یہ حرکت بے جا معلوم نہ ہوئی ۔

ہم تینوں جلاوطنوں کی طرح موٹر سے نکلے ۔ برآمدوں میں قمقموں کی روشنی، خدمتگاروں کے لباسوں کی جگمگاہٹ اور قدِ آدم تصویروں کی رونق سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ گویا یہ عمارت کوئی عظیم الشان بستی ہے ۔ جس کے مکینوں نے بازارِ حل کو خوب سجا رکھا ہے ۔ میرے رفیق رئیس زادے نے ہمیں رک جانے کا اشارہ کیا اور لحظہ بھر کے لئے اپنی گھڑی کو دیکھا کہ مبادا ہم وقت سے پیشتر پہنچ گئے ہوں ۔ گویا اگر ہم وقت سے پیشتر پہنچ جاتے تو ہمارا داخلہ وہاں ممنوع قرار دیا جا سکتا تھا ۔ یہ نوبت نہ آئی ۔ کیونکہ وہاں ہمارا نزول ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہی ہُوا ۔

ہم تینوں اسی طرح خاموش کھوئے کھوئے سے آگے بڑھے ۔ برآمدے میں قدم رکھا ۔ تو قریب ہی صاحبِ خانہ ایک تنہا ستون کی طرح کھڑے نظر آئے ۔ گویا وہ ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے ہی وہاں ہمارے منتظر کھڑے تھے ۔ انہیں یُوں دیکھ کر ایک عجیب سی مسرت دل و دماغ پر چھا گئی ۔ مجھے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے انہوں نے صرف میرا ہی استقبال کرنے کے لئے باہر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے ۔ اس قسم کا روحانی سرور مجھے عرصہ کے بعد میسر آیا تھا ۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے ۔ اور انہوں نے مجھ سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا ۔ مختلف قسم کے بھیانک سے واہمے جو رفتہ رفتہ میرے ذہن پر مسلط ہو گئے تھے ۔ یکدم مفقود ہو گئے ۔ صاحبِ خانہ اپنے بڑے پیارے مخصوص انداز میں کبھی اپنے سر کو دائیں اور کبھی بائیں طرف جھکاتے، مسکراتے، شرماتے ہوئے بڑھتے فرما رہے تھے ۔ "مجھے معلوم تھا آپ ضرور آئیں گے ۔ آپ نے بڑا اچھا کیا ۔ جو چلے آئے ۔ آیئے نا اندر تشریف لایئے ۔ میں تو آپ کا ہی منتظر تھا ۔"

ہم سب صاحبِ خانہ سمیت ہال کمرے میں وارد ہوئے کمرہ حسن و زیبائش کی ایک اچھی خاصی نمائش گاہ تھا ۔ بڑے بڑے معزز مہمان صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے تھے ۔ سامنے آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں نے مجھے ایک پل کے لئے اپنے گھر کا جھلسا ہُوا ماحول یاد دلا دیا ۔ بایں ہمہ میں خوش تھا کہ مجھے صاحبِ خانہ حسبِ توقع ملے ہیں ۔ ہم تینوں بھی خالی نشستیں دیکھ کر بیٹھ گئے ۔ اور صاحبِ خانہ ہم سے اجازت لے کر باہر چل دیئے ۔ میرا خیال تھا کہ شائد چند لمحوں کے لئے گئے ہیں، ابھی آ کر بیٹھیں گے ۔ میں اپنے دونوں ساتھیوں سے ہمکلام نہ ہُوا ۔ کیونکہ وہ میری طرح اس فضا سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہے تھے ۔ جو ہمیں غیر معمولی طور پر اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی ۔ میں نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اپنے

آس پاس کی چیزوں کا جائزہ لینے میں منہمک ہو گیا۔ کمرے کے مختلف حصوں میں ننھے ننھے جھرمٹ بنے ہوئے تھے۔ جن میں لڑکے اور لڑکیاں باہم بیٹھے دبی دبی گفتگوؤں میں مشغول تھے۔ ایک سہما سہما سا ہلڑ مچ رہا تھا۔ جو باتوں، قہقہوں اور چوڑیوں وغیرہ ایسی چیزوں کی آوازوں پر مشتمل تھا۔ کبھی کبھی جھرمٹ کی بحث و تمحیص سے ایک آدھ فقرہ میرے کان میں بھی پڑ جاتا۔ "جی ہاں! وہ امریکہ میں ہیں۔ غالباً کل یا پرسوں شکاگو سے نیو یارک پرواز کر جائیں گے۔ بڑے خوش نصیب ہیں جو کرسمس وہاں گذار رہے ہیں۔" میں غور کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی صاحب شکاگو سے نیو یارک پرواز کرنے والے ہیں۔ لیکن وہ کرسمس وہاں گذارنے سے آخر کس صورت میں خوش نصیب ہو سکتے ہیں۔ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ اگر پردیس میں انسان رونق دیکھے تو عموماً مغموم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اُسے اپنا دیس یا اقربا یاد آ جاتے ہیں۔ پردیس میں جا کر دیس کو تو وہی بھول سکتا ہے جو یا تو اپنوں سے نالاں ہو یا فطرتاً "تاریک دل" ہو

مَیں خاموشی سے ہر شئے کا جائزہ لیتا رہا۔ جیسے کوئی نہایت ہی سُست خرام خواب دیکھ رہا ہو۔ میرے دونوں ساتھی بھی میری طرح ہر چیز کے بارے میں اپنے اپنے نظریے قائم کرنے میں مشغول تھے۔ بہر حال میں صاحب خانہ پر بے حد نازاں تھا۔ اُن کے اخلاق نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ جب کبھی فضا مجھے بوجھل سی محسوس ہونے لگتی یا مہیب اجنبیت کی گول گول آنکھیں مجھے گھورتیں تو مَیں اپنے میزبان کے پیارے سے مخصوص انداز گفتگو اور حرکات کو اپنی نظروں کے سامنے لے آتا۔ ابھی تک صاحب خانہ اپنے وعدے کے مطابق میرے پاس نہ آئے تھے۔ مَیں ایک بار پھر اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔ ننھے ننھے جھرمٹ لگاتار مصروف تھے۔ ان کا اندازِ تکلم مجھے خواب اور موسیقی کی طرح سہانا معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک مجھے صاحبِ خانہ دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور لمحہ بھر کے لئے مَیں پھر مسرت سے سرشار ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ چند مہمانوں کو اندر لا رہے تھے۔ اور اپنے اُسی پیارے اور مخصوص انداز میں اُن سے فرما رہے تھے "مجھے معلوم تھا۔ آپ ضرور آئیں گے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا۔ جو چلے آئے۔ آئیے نا۔ اندر تشریف لائیے۔ میں تو آپ ہی کا منتظر تھا" مجھے ایک دھکا سا لگا۔ گویا چلتے چلتے کسی پتھر سے ٹھوکر کھا گیا ہوں۔ میرے دماغ پر بے ڈھنگے سے وسوسے ایک بار پھر رینگنے لگے۔ بار بار مجھے یہی خیال آ رہا تھا کہ میرے میزبان کے تلطف آمیز کلمات صرف میری دلجوئی کے لئے ہی کہے گئے تھے یا محض رسمی رواداری تھی۔ کہیں میرے جذبات سے کھیلا تو نہیں جا رہا۔ کہیں میرے احساسات کا تمسخر تو نہیں اڑ رہا لیکن ہر بار میں اپنے آپ کو یہی تسلی دے دیتا کہ آخر میری ذات میں ایسا کون سا گن ہے۔ میں آخر ہوں کون۔ آخر مجھے حق کیا ہے۔ جو اپنے میزبان کو صرف اپنے لئے ہی مخصوص سمجھوں۔ میرے جیسے یہاں کئی موجود ہیں اور بیسیوں چلے آ رہے ہیں۔ صاحبِ خانہ اپنے فرائض میزبانی کو صرف میری خاطر کیوں بالائے طاق رکھ دے اور صرف میری تمناؤں کی تکمیل کے لئے دنیا بھر سے کیوں بگاڑ لے۔ مَیں تو اوّل درجے کا بے وقوف ہوں۔ ہر جگہ اپنے جذبات سے چھلکتے ہوئے باطن کو لئے پھرتا ہوں۔ پر ایک لحاظ سے بے قصور بھی ہوں۔ کیونکہ مجھے کبھی اُن کے ہجوم کی تطہیر کا موقعہ ہی نہیں ملا

کمرے کی فضا ابھی تک ویسے ہی بٹی بٹی سی تھی۔ جیسے دھول پر بے ڈھب کنکریاں بکھری پڑی ہوں۔ میرے دونوں رفیق بھی بھوت ہر ایک کی حرکات کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ رئیس زادہ جسے برازیل کی چائے بڑی بھاتی ہے۔ اپنی خوابیدہ سی نگاہوں کو نہ جانے کس نقطہ پر جمائے ہوئے تھا۔ اور حسن پرست مصوّر غالباً شمع دان میں بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں کسی یونانی مجسمے کے جسمانی پیچ و تاب کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں اب کی بار نو واردوں کے خط و خال کو عمیق نظروں سے دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ جو کسی مختصر سی ریاست کے نوابزادے

معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سے قد منحنی سے جسم بھیگی
بھیگی سی نگاہیں اور ان کا مرتعش سا لہجہ مجھے ان کے آباو اجداد
کی یاد دلا رہا تھا۔ جن کی آنا ڈھکو منیں ہوا کرتی تھیں۔ جو اپنے
غنیموں کا مقابلہ وسیع میدانوں میں کیا کرتے تھے۔ اور جن
کی شجاعت و دلیری کے قصے اب الف لیلے کی داستانیں معلوم
ہوتی ہیں۔ مجھے ان کے اڑے اڑے سے رنگوں پر رحم سا آ
رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا۔ اُن کے پاس جا کر کہہ دوں کہ خطا
اُن کی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی غلیظ فطرت رعایا کی ہے۔ جو
انہیں یہ بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں۔

مَیں ابھی تک انہی تصورات میں محو تھا۔ جب مَیں نے
اپنے میزبان کو چند ایک مہمانوں کے ہمراہ اندر آتے دیکھا۔
مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی میری پسلیوں میں گھونسے مار رہا
ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ "مجھے معلوم تھا آپ ضرور آئیں گے۔
آپ نے بڑا اچھا کیا چلے آئے۔ آئیے نا۔ اندر تشریف لائیے
مَیں تو آپ ہی کا منتظر تھا ــــ" اب میرے میزبان کے چہرے
پر سکون و اطمینان کے آثار نمودار ہو گئے تھے جو اکثر فرض کی
ادائیگی کے بعد عیاں ہو جایا کرتے ہیں۔ سب مہمان آچکے تھے
کسی کا انتظار باقی نہ تھا۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ صاحبِ خانہ
اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے
ہیں۔ ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل کی گہرائیوں میں
شہد کا فوارہ پھوٹ نکلنے کو ہے۔ مَیں اپنے میزبان کے لطف و
کرم کا کس قدر مرہونِ منت ہوں۔ آخر انہیں میرا خیال آہی گیا
اُن کا ہر اُٹھتا ہوا قدم میرے لئے پیامِ زندگی تھا۔ وہ میری طرف
کھنچے چلے آ رہے تھے۔ حتےٰ کہ میرے قریب پہنچ گئے مَیں
نے دھڑکتے ہوئے دل سے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے
اپنے کوٹ کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر مجھے پکڑا
دیا۔ مَیں نے اُسے بغیر دیکھے پوچھا "یہ کیا ہے؟" انہوں نے
ہنستے ہوئے جواب دیا "پڑھ لیجئے۔ اور اس کے مطابق اپنی
شریک تلاش کیجئے" وہ مسکراتے ہوئے جھرمٹوں میں پُرزے بانٹتے

دُور نکل گئے۔ مَیں نے اس پُرزے کو دیکھا۔ اس پر لکھا تھا "بندر"
آخر بندر کیوں؟ یہ مذاق کس نوعیت کا ہے؟ انہوں نے میری
کونسی ایسی حرکت دیکھ کر مجھے اس خطاب سے سرفراز فرمایا؟
سب کے سب معزز مہمان اپنے اپنے پرزے کھول کر پڑھ رہے
تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ ہر شخص اپنے
جدید نام کو دیکھ کر صاحب خانہ کی نکتہ سنجی کی داد دیدہ دانستہ دے
رہا ہے مگر صرف میں ہی ایک کور مغز ہوں۔ جسے کسی نتیجہ پر پہنچنے سے
پیشتر پہروں سوچنا پڑتا ہے۔

"خود سنئے تو ــــ" مَیں اپنے میزبان کا بازو پکڑتے
ہوئے بولا۔ جو پُرزے بانٹنے کے بعد ایک بار پھر کمرے سے خارج
ہوا چاہتے تھے۔ "کہئے۔ کہئے" اُن کے مسکراتے ہوئے لبوں سے
موتی گرے۔ "آخر اس پُرزے کا کیا مقصد ہے اور اس وقت
غلام کو کیا کرنا ہے؟" مَیں نے اُن سے معصومانہ انداز میں پوچھا۔
وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "دیکھئے آپ بندر
ہیں۔ اور ان لڑکیوں میں آپ کو بندریا تلاش کرنی پڑے گی جس
کی خاطر داری کرنا آپ کا فرض ہوگا۔ جائیے تلاش کیجئے باقی سب
بھی تو کر رہے ہیں۔ گھبرائیے نہیں!"

میرے میزبان کو دائیں طرف سے کسی نے پکارا اور وہ
اس طرف نکل گئے۔ ایک عجیب قسم کی بے بسی میرے رگ و پے
میں رچی جا رہی تھی۔ زندگی میں اپنے آپ کو لاچار محسوس کرنے کی
عادت تو پڑ ہی چکی ہے۔ لیکن اب میں اپاہج بھی محسوس کر رہا تھا۔
آخر میں کیونکر اپنی شریک تلاش کروں۔ کس طرف جاؤں۔ یہاں
تو میرا کوئی شناسا تک نہیں۔ مجھے یہ محدود کمرہ ایک وسیع صحرا
معلوم ہو رہا تھا جس میں ہر طرف سراب ہی سراب ہوں۔ وہاں
منتشر میز اور کرسیاں انسانی پنجروں کی طرح مجھے دکھائی دے
رہی تھیں۔ اور میرے تخیلات نے مردار خور گِدھوں کی صورت
اختیار کر لی تھی۔ جو مجھے سسک سسک کر مرتا دیکھنے کے
منتظر تھے۔ میرے دونوں رفیق بھی بے حس بالکل جامد اپنی اپنی
نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اپنے خوابوں کی دنیا میں

بسنے والے رئیس زادے کی طرف یاس بھری نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ میرے اس انداز سے یہ سمجھا گویا مَیں اُس کے پُرزے کے بارے میں پُوچھ رہا ہوں۔ اُس نے دُور ہی سے اپنا پرزہ کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔ اُس پر موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ "گدھا"۔ مَیں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اُس سے نگاہیں پھیر لیں۔

کمرے میں اب تو ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہو۔ چاروں طرف چیخیں سی بلند ہو رہی تھیں "آپ میں سے بھینس کون ہے؟"۔ "مَیں نے عرض کیا، کیا آپ ہتھنی ہیں؟" "کوئی کوئی پپیہا۔" گھوڑی ابھی تو یہیں تھی لیکن اب کیا ہوئی؟" "ارے بھئی! ناگن کہاں ہے ناگن؟" "مجھے تو بلّی کی تلاش ہے۔" "اونٹنی کا کہیں سُراغ ہی نہیں ملتا"۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی چڑیا گھر میں چرند و پرند باہم خلط ملط کر دئے گئے ہوں، یا جیسے کسی جنگل میں سیلاب آجانے کی وجہ سے ہر قسم کے جانوروں نے ایک ہی مقام پر پناہ ڈھونڈی ہو۔ اور اپنے شریکوں کی تلاش میں چیختے پھر رہے ہوں۔

رفتہ رفتہ یہ طوفان تھما۔ جب ہر ایک کو اپنی اپنی شریک مل گئی تو صاحبِ خانہ باوازِ بلند بولے۔ "چلئے حضرات! اب اس طرف تشریف لے آئیے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی شریکوں سمیت ہنستے، اُچھلتے، کھیلتے شور مچاتے کھانے والے کمرے کی جانب چل دئے۔ اور قابلِ تعجب بات تو یہ ہے کہ میں بھی "جیسا دیس ویسا بھیس" کے مصداق اپنے تمام باغی نظریوں کو نظر انداز کر کے آندھی کے ان جھکولوں میں شامل ہو گیا۔ جن کا رجوع اب ایک جگہ سے دوسری جگہ ہو رہا تھا۔ میری شریک ایک شرمیلی سی لڑکی تھی جو اس ماحول سے کافی مانوس معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اُس نے کبھی اسے اُس زاویے سے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ جس سے دیکھ رہا تھا۔ میرے دونوں ساتھی بھی میرے پیش پیش ہی تھے۔ البتہ رئیس زادہ کافی حد تک قانع معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی شریک کی غیر حاضری کی وجہ سے تنہا تھا یا دوسرے لفظوں میں لاشریک تھا۔

کھانے والے کمرے میں حالات مختلف تھے۔ ایک چوڑے سے میز پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی تھیں۔ ڈونگوں میں شوربے، سبزیاں اور بھُنے ہوئے مُرغ یوں پڑے رہے تھے گویا وہ زندہ ہیں۔ اور انجام سے باخبر ہیں۔ اس کمرے میں کُرسیاں مفقود تھیں۔ لہٰذا سب میز کے اِرد گرد، کوئی انگیٹھی کے قریب، کوئی الماری کے پاس کھڑے ہو کر تھالیاں ہاتھوں میں تھامے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کسی کو اپنی شریک کا خیال نہ رہا۔ ایک افراتفری سی تھی۔ جیسے قیامت کا دن ہو یا جیسے ہم کسی مغربی صنعت و حرفت کے کارخانے میں آگئے ہوں۔ جہاں ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔ کوئی دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں۔ کوئی کسی کا غمگسار نہیں۔ صرف کانٹوں اور چھُریوں کی آوازیں پُرانے زمانوں کی جنگوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ہر ڈونگے، ہر طشت اور ہر تھالی کی متاع لٹ رہی تھی۔ میز کے اِرد گرد کھڑے لوگ یوں معلوم ہوتے تھے۔ گویا بہت سے ڈاکٹر کسی مریض پر عملِ جراحی کرنے والے ہوں۔

کھانے کے اختتام پر سب خراماں، خراماں، دو دو تین تین کی ٹولیوں میں پھٹے ہوئے بادل کی طرح ایک بار پھر ہال کمرے میں چل دیے۔ مَیں اور میرے دونوں رفیق ابھی دروازے تک ہی پہنچنے پائے تھے کہ صاحبِ خانہ پھر ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اور لاشریک رئیس زادے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے "آپ کی شریک نازل ہو گئی ہے"۔ معاً پھولوں اور پھلوں سے لدی شاخ کی سی لڑکی داخل ہوئی۔ اُس نے گلابی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے اپنے رنگ کے کافی مشابہ تھا۔ وہ دُور سے بغیر جواہرات کے بھی شاہزادی معلوم تھی۔ اُس کے خمیدہ ابرؤوں اور مصنوعی مسکراہٹ سے صاف

ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو شہزادی تصور کرتی ہے اور اُسے اپنے آپ پر بے حد اعتماد ہے۔ ہمارے میزبان نے اُس سے رئیس زادے کا تعارف کرایا اور وہ بیچارا خاموش اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

ہال کمرے میں ہر جوڑے نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال رکھی تھیں۔ مجھے بھی اصول کے مطابق اپنے شریک کے ساتھ رہنا تھا۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں سے کہیں دُور بیٹھ گیا۔ مگر میرے بیٹھتے ہی میرے بائیں طرف کھڑی ہوئی دوشیزہ نے جس کی آنکھیں اس قدر مبہم اور ویران سی تھیں۔ جیسے صحراؤں میں سموم چل رہی ہو، مجھ پر سوال کیا "کیا آپ ذہین ہیں؟" لمحہ بھر کے لئے میرا تمام ماضی ایک بجلی کی طرح میری نگاہوں کے سامنے کوند گیا۔ ساتویں جماعت میں ناکامیاب رہا۔ نویں میں التجائیں کر کے کامرانی حاصل کی۔ کبھی کوئی انعام نہیں لیا۔ ہمیشہ تیسرے درجے میں کامیاب ہوا۔ بھلا میں کیونکر ذہین ہو سکتا ہوں۔ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "جی نہیں۔ میں ذہین نہیں ہوں۔" "لیکن صاحبِ خانہ تو کہتے تھے۔ آپ قابلِ داد ذہانت کے مالک ہیں۔" اس نے اپنے ابروؤں کو آسمانوں کی طرف اٹھاتے ہوئے پوچھا "میرا خیال ہے انہیں میرے متعلق غلط اندازہ تھا۔" میں نے انکساری سے جواب دیا۔ مگر وہ پھر اسی انداز میں بولی "تو پھر آپ ہیں کیا؟" خیر اس سوال کے جواب دینے کے لئے تو بہت وقت درکار تھا۔ لہٰذا میں خاموش رہا۔ اور یوں بہانہ کیا۔ گویا یہ سوال سُنا ہی نہیں۔

لیکن اب تو صاحبِ خانہ بھی ہماری ہوشمندی کے امتحان پر تلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے ہر جوڑے کے ہاتھ میں ایک ایک خالی ورق پکڑا دیا۔ اور بولے "اب آپ سب کی تیز فہمی کا امتحان ہوگا۔ آپ مہربانی کر کے اپنے اپنے نام ان اوراق پر لکھ دیجئے۔ اور جو سوالات میں کروں۔ ان کے جواب لکھتے جائیے۔ میں بیس سوال بولوں گا۔ اور ہر سوال میں صرف پل بھر کا ہی وقفہ ہوگا۔ لیجیے میں پہلا سوال بولتا ہوں۔ اور ہاں ہر جوڑہ مل کر جواب دے۔ کوئی دوسرے کی مدد نہ کرے۔"

مجھے میرے میزبان کا یہ امتحان ایک انوکھی سی کشمکش معلوم ہو رہا تھا۔ آخر وہ صرف میری فراست اور ذکاوت سے ہی میرے احساسات کو پرکھنا چاہتے تھے یا یہ محض ایک شغل تھا۔ جس سے مجھے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کے چہرے پر وہ بے چینی سی نظر آ رہی تھی جو عموماً امتحان کے ایوانوں میں داخل ہوتے وقت مرجھائے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں پر ظاہر ہو جایا کرتی ہے۔ ہمارے ممتحن نے سوالات شروع کر دیے۔ اور سب بڑے انہماک سے جوابات لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ صرف میں ہی ایک کُند ذہن تھا۔ جو اُن کے مشکل سوالوں کے جواب لکھنے سے قاصر تھا۔ البتہ اپنی شریک کی جودتِ طبع کی صاد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں اور گھبرائے ہوئے خط و خال سے مجھے جوابات لکھوائے۔ پر وہ تنہا بھی کیا کر سکتی تھی۔ کچھ جوابات تو صحیح نکلے مگر زیادہ غلط ہی تھے۔ اور کئیوں کے تو جواب لکھنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔ وقت کے اختتام پر ہم سے وہ اوراق لے لئے گئے اور چند ہی ساعتوں بعد ہمیں نتیجہ بھی سنا دیا گیا۔ تمام جوابات صرف اُسی دوشیزہ کے صحیح تھے۔ جس نے اپنی آنکھوں میں ریگستان اُتار رکھے تھے۔ لہٰذا اسے انعام دیا گیا۔ اور مجھے اس کی دانشمندی کا اعتراف کرنا پڑا۔ آخر وہی تو میری ذہانت کے بارے میں شک میں تھی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر شور بلند ہوا کہ کوئی کھیل کھیلا جائے۔ کوئی نہایت ہی انوکھا کھیل جو آج تک کسی نے نہ کھیلا ہو۔ آہستہ آہستہ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ایک دوسرے کے کانوں میں لوگ اپنی پسند کے کھیل بتا رہے تھے۔ مگر میں اور میرے دونوں ساتھی اُسی طرح خاموش اپنی اپنی شریکوں کے ہمراہ بیٹھے سوچ رہے تھے کہ آخر کھیل سے کیا مراد ہے۔ کیا ابھی تک ہم سب عہدِ طفلی سے گذر رہے ہیں۔ جو ہمیں اپنا دل بہلانے کے لئے کھیلوں کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے اور خاص طور پر مجھے تو کھیل کا لفظ سُن کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے پیتے ہوتے

زریں ایام کے متعلق سوچنے والے بوڑھے کے کان میں کوئی آکر کہہ دے۔ "دو آؤ کبڈی کھیلیں۔" اور وہ یاس و التجا بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر جواب دے۔ "مجھے کیوں طعنہ دے رہے ہو۔ صرف اسی لئے کہ میرے کھیل کے دن عرصہ ہوا گذر چکے ہیں۔" خیر مشورے دیے جا رہے تھے۔ لیکن اسی دوران میں ایک لمبی سی ناک والا دُبلا سا نوجوان اپنی نشست سے اُٹھ کر درمیان میں نکل آیا تھا اور محفل کو اپنی عجیب و غریب حرکات سے سامان تمسخر بہم پہنچا رہا تھا۔ وہ اپنی انگلیاں ناک پر رکھتا، ناچتا، کودتا اور خدا جانے کیا کیا آوازیں نکالتا۔ رفتہ رفتہ اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تھوڑے عرصے کے لئے کھیل کے مشورے ایک طرف رکھ دیے گئے اور لوگ اُس کی حرکات پر ہنسنے میں مشغول ہو گئے۔ جوں جوں قہقہوں کے سیلاب بڑھتے وہ چہکتا چلا جاتا۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ نہ رُکا۔ اس کے کرخت سے چہرے اس کی رقص کرتی ہوئی نگاہوں اور اس کے کھلے ہوئے بازوؤں سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہے "میں حسن کی دولت سے محروم ہوں۔ تندرستی مجھ سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ میں اپنی لیاقت کی وسعت سے تمہیں زیر نہیں کر سکتا۔ لیکن کمبختو! پھر بھی میں تمہیں ہنسا سکتا ہوں۔ میری طرف دیکھو۔ میں نے اپنی شکل کیا بنا رکھی ہے۔ میں کیا حرکات کر رہا ہوں۔ مجھے بھانڈ تصور کرو مسخرا جانو اور ہنسو، قہقہے لگاؤ۔ آخر تم میں سے کون ہے۔ جو میری طرح اوروں کو ہنسا سکتا ہے۔ میں اپنے طرز کی آپ ہی مثال ہوں۔ ظالمو! تم سمجھو یا نہ سمجھو۔ اسی میں میری یکتائی مضمر ہے۔ اسی میں میری وحدت پوشیدہ ہے۔ ہنسو۔ میں ابھی تک تھکا نہیں ہوں۔ حالانکہ میرا سانس پھول گیا ہے۔" اب تو قہقہوں نے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کمرے کی فضا اُن کی گونج سے ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح لرز رہی تھی۔ لوگ تھے۔ کہ پسلیاں تھامے اپنی نشستوں سے گر گر پڑتے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُسے باہر اندھیرے میں لے جاؤں جہاں ہم ایک دوسرے کی شناخت نہ کر سکیں اور اُسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہوں۔ "مجھے تمہاری عظمت کا اعتراف ہے۔"

ہولے ہولے یہ طوفان تھا۔ لوگ سنبھل گئے اور وہ دُبلا سا نوجوان اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ بعد میں جب کسی نے کہہ دیا۔ "ہاں تو کوئی کھیل ——— !" تو صاحب خانہ اُٹھے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے "یہ کھیل ہم نے سوچ لیا ہے۔" پھر لڑکوں کو ان کی جگہوں سے اٹھاتے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے "یہ کھیل ہم نے سوچ لیا ہے۔" پھر لڑکوں کو اُن کی جگہوں سے اٹھاتے اور ملحقہ کمرے میں لے جاتے۔ میری طرف بھی آئے اور اصرار کرنے لگے کہ میں بھی ساتھ والے کمرے میں اُن کے حکم کا منتظر رہوں۔ لیکن میں نے معذرت چاہی اور کہا کہ غلام کو اگر ناظر کی حیثیت ہی بخش دی جائے۔ تو ہفت اقلیم کی بادشاہت سے کم نہیں۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ مجھے زبردستی پکڑ کر ملحقہ کمرے میں لے گئے۔ اور باہر سے دروازے کو مقفل کر گئے۔

میں اس زندان میں تنہا نہ تھا۔ بلکہ بہت سے اصحاب یہاں سہمی سہمی نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گویا مختلف ملکوں کے باشندے ہیں جنہیں ایک دوسرے کی زبان سے نا واقفیت ہے۔ اتفاق سے میرے دونوں رفیق بھی یہاں موجود تھے جنہیں دیکھ کر میرا حوصلہ قدرے بڑھ گیا تھا۔ اور ہاں وہ نوابزادے بھی جو سردی کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ اور نالاں تھے۔ کہ انہیں کس گناہ کی بنا پر اس برف خانہ میں جھونک دیا گیا ہے۔ یہ کمرہ غالباً کتب خانہ تھا۔ جس میں جا بجا الماریوں میں بند کتابیں پڑی تھیں۔ دروازے کے مقفل ہونے کی وجہ سے ہم ساتھ والے بڑے کمرے سے بالکل منقطع تھے۔ نہ تو کچھ دیکھ ہی سکتے تھے۔ اور نہ سن ہی سکتے تھے۔

اتنے میں دروازہ کھلا صاحب خانہ ہم میں سے ایک کو باہر لے گئے اور دروازہ پھر بند کر گئے۔ ان کے جاتے ہی ہم نے کان تختوں سے لگا دیے۔ کہ آخر اس بے کس کا کیا حشر ہوتا ہے چند لمحے تو سکوت رہا۔ پھر یکدم ایک بھیانک قہقہہ پڑا۔ یہ قہقہہ ہم سب کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ لحظہ بھر کے لئے ہم سب لرز گئے

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ہوگا کیا۔ ایک ہیبت ناک سی تشویش نے سب کا احاطہ کر رکھا تھا۔ کیئوں نے ہمت کر کے ایک دوسرے سے پوچھا بھی۔ لیکن اس کھیل کے بارے میں تو کوئی کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ دروازہ پھر کھلا۔ ایک شخص کو قربانی کے بکرے کی طرح گھسیٹا گیا۔ دروازہ مقفل ہوگیا۔ خاموشی کا مختصر سا وقفہ آیا۔ اور پھر وہی جانسوز قہقہہ پڑا۔ ہماری حالت اُن مجرموں کی سی تھی۔ جن میں سے ایک ایک کو بلا کر شارع عام پر قتل کیا جا رہا ہو۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر بے بس تھا۔ دروازہ کئی بار کھلا اور بند ہوا۔ کتب خانہ کے مکین کم ہوتے چلے گئے خاموشیاں رہیں اور قہقہے پڑتے گئے۔ حتےٰ کہ میری باری آگئی۔

میں لرزتے ہوئے دل اور کانپتی ہوئی ٹانگوں سے صاحب خانہ کے ہمراہ باہر نکلا۔ قتل گاہ میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ تماشائی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ صرف سات لڑکیاں کمرے کے عین وسط میں نبات النعش کی طرح کھڑی تھیں۔ صاحب خانہ نے مجھ سے فرمایا۔ "میں آپ کی ملاقات کرانے لگا ہوں۔" اور پھر لوگوں کو مخاطب کر کے بولے "حضرات یہ چین کے ایلچی ہیں۔" ایک بھینچی ہوئی مسکراہٹ نے خلقت کے ہونٹوں پر یونہی سا رقص کیا۔ پھر وہ مجھے ایک لڑکی کے قریب لے جاتے ہوئے بولے۔ "یہ محترمہ لال ہتیلی ہیں۔" میں نے اُس سے ہاتھ ملا دیا۔ "یہ ایلیلی ہیں۔" وہ مجھے دوسری کے پاس لے جاتے ہوئے کہنے لگے۔ جوں جوں میں بڑھ رہا تھا۔ میری تشویش بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ آخر قہقہہ کس بنا پر پڑتا ہے۔ بلاشبہ میرا ہر اٹھتا ہوا قدم مجھے کسی سانحہ کی طرف لئے جا رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں امید و بیم کی حالت میں چلتا جا رہا تھا حتےٰ کہ چلتے چلتے میں آخری لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اور صاحب خانہ نے اس سے بھی میرا تعارف کروا دیا۔ لیکن ابھی میں پوری طرح ہاتھ ملانے نہ پایا تھا کہ اُس دوشیزہ نے اپنے دوسرے ہاتھ سے پورے زور کے ساتھ ایک تھپیڑ چٹاخ سے میرے گال پر رسید کیا۔ لمحہ بھر کے لئے میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں نور سے محروم کردی گئی ہیں۔ مجھے دیواروں پر دھبے سے ناچتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اور دُور مجھے لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں جیسے بجلی گر چکنے کے بعد اکثر بادل گرجا کرتے ہیں۔ میری نگاہوں پر پانی کی ایک چادر سی چھا گئی۔ لیکن اس دھندلکے کے باوجود میں نے تلاش کر لیا کہ میرے ساتھ آمادۂ پیکار ہونے والا کون ہے۔ یہ وہی میرے رئیس زادے کی شریک پھولوں اور پھلوں ایسی لدی شاخ تھی۔ جو جواہرات کے بغیر بھی شاہزادی معلوم ہوتی تھی۔ اور جسے اپنی ہر شے پر بڑا اعتماد تھا۔ لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میری حسرت بھری نگاہیں اپنے رفیق حسن پرست مصوّر پر پڑیں۔ جو انگیٹھی کے قریب مرمر کے ایک مجسمہ کی طرح جامد کھڑا میرے خدوخال کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور مجھے یوں معلوم ہوا۔ گویا کہ رہا ہے "کوئی بات نہیں۔ معمولی حادثہ ہے۔ ایسے حادثے اکثر زندگی میں پیش آجایا کرتے ہیں۔" میں نے ایک بار پھر اُس گستاخ شاخ کی حاکمانہ آنکھوں اور مسکراتے ہوئے لبوں کی جانب دیکھا۔ جو مجھ سے بلا وجہ الجھی تھی۔ جس نے میرے جذبات کی ریشمی چادر کو تار تار کر دیا تھا۔ اور جس کے پھولوں اور پھلوں میں مخفی کانٹوں کا احساس مجھے ابھی ابھی ہوا تھا۔ میرے ہاتھ نے خود بخود اٹھ کر میرے رخسار کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ گویا گزشتہ بوسوں کے اس باقی ماندہ خزینے کو قزاقوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو ماں نے مجھ سے چھپا کر میری نیند کی مدہوشیوں میں نہ جانے کن کن امنگوں اور تمناؤں کے طوفان سے بے قابو ہو کر مجھے بخش دیے تھے۔ اور جن میں سے کئی ایک اسی لحظہ سلب بھی جا چکے تھے۔ میں تو یہاں ایک بھرا ہوا دل لے کر آیا تھا۔ اس دہلیز پر احساسات کے وسیع دستر خوان سے بچے کچھے ٹکڑے چننے آیا تھا۔ مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ یہاں پہنچ کر بھی گردش ایام میرا تمسخر اڑائے بغیر نہ رہ سکے گی۔

کمرے کی فضا ابھی تک قہقہوں کی گونج سے بھاری تھی۔

اور مجھے ہر طرف اُسی بے باک کے سُرخ لب جو ایک نیم وا خونچکاں زخم کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ یہی کہتے محسوس ہو رہے تھے "تمہیں کس کمبخت نے یہاں آنے کو کہا تھا۔ تمہارے ایسے عاری از حیات کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ یہ کوئی بیمارستان نہیں ہے۔ جو یہاں شفا ڈھونڈھنے چلے آئے ہو۔ تمہیں تمہارا ویران گھر اور تمہاری گرتی ہوئی دیواریں مبارک ہوں۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ تو ایک عشرت کدہ ہے۔ جہاں ہم اپنے والدین سے صرف چند لمحوں کی اجازت لے کر ان کی محبت بھری التجاؤں کے باوجود انہیں تنہا چھوڑ کر مسرت تلاش کرنے چلے آتے ہیں۔ تمہاری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی داستانیں سننے نہیں آئے۔ جو شیطان کی آنت کی طرح طویل ہیں۔ ہم کو بھی واپس جانا ہے کئی پیار بھری نگاہیں منتظر ہوں گی۔ تمہارا کیا ہے۔ خواہ ساری رات ہی آوارہ گردی کرتے گذار دو۔ تمہاری منظر ویرانیاں ہیں۔ اداسیاں ہیں۔ لہٰذا تم تو لوٹنے کے خواہشمند ہی نہیں ہو۔ لیکن ہم یہاں، رونے نہیں آئے۔ ہنسنے آئے ہیں۔ اگر تمہاری پیشانی چومنے والے تمہیں سینوں سے لگانے والے، تمہیں گودوں میں سلانے والے مر چکے ہیں۔ تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اُس خدا کو اپنا دل دکھاؤ اس کے سامنے گڑگڑاؤ۔ جس نے تم سے تمہاری خوشیاں چھین رکھی ہیں۔ ہمارے پاس کیوں چلے آئے ہو۔ کیا ہم تمہاری مسرتوں کے قاتل ہیں ـــــــــ جاؤ، یہاں کسی کو تمہاری حاجت نہیں ہے ـــ"

میں اپنی نشست پر لوٹ آیا۔ مگر اب تو سبھی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ صاحب خانہ پھر برآمدے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ اور سب کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں "یہ شام بہت اچھی گذری"۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ "کھانا بے حد لذیذ تھا"۔ "میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں ــ" اور صاحب خانہ اپنے بڑے پیار سے مخصوص انداز میں کبھی اپنے سر کو بائیں اور کبھی دائیں طرف جھکاتے ہوئے فرما رہے تھے "آپ نے بڑا اچھا کیا جو چلے آئے"۔ "آپ کے بغیر سب کچھ ویران ہو جاتا"۔ "آپ نے بڑا احسان کیا۔ جو آ گئے"۔ میں بھی اُٹھا اور اپنے دونوں رفیقوں کے ہمراہ خراماں خراماں چلتا جیسے کوئی خواب میں چلتا ہو۔ اپنے میزبان کے قریب پہنچ گیا اور اجازت چاہی "آج کی محفل تو خوب رہی ہے نا؟" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پُوچھا۔ اور میں نے یونہی سر کو جنبش دے دی "میں نے لکھا تھا نا کہ آپ بے نیلِ مرام واپس نہ آئیں گے"! "واقعی" میں نے جواب دیا۔ اور اُنہیں خدا حافظ کہنے کے بعد اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ موٹر تک آیا۔ باقی مہمان بھی اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ کر رخصت ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر بے ترتیبی سی پھیل گئی تھی۔ لیکن اس وقت میں موٹر پر چڑھنا نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دونوں رفیقوں سے اجازت لی۔ اور پیدل سڑک پر نکل آیا۔ میرے قریب سے سرسراتی ہوئی موٹریں بگولوں کی طرح نکل کر دھند میں غائب ہو رہی تھیں۔

میں تنہا سڑک پر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر بھیگی بھیگی چاندنی گداگروں کی طرح محوِ خواب تھی پیٹریوں پر آویزاں بجلی کے قمقمے مجھے قہقہے لگاتے ہوئے ہنستے معلوم ہو رہے تھے۔ اور ہوا کے شدید جھکڑوں سے سائیں سائیں کرتے درخت غولِ بیابانی کی طرح میری بے بسی پر تالیاں بجانے میں محو تھے۔ دھند ایک خانماں برباد کی صورت میں پریشان اڑتی پھر رہی تھی۔ میرا ہاتھ ابھی تک میرے رخسار کو اُس تند ہوا کے تھپیڑوں کے خوف سے ڈھانپے ہوئے تھا۔ جو بہیم طمانچوں کی طرح مجھ پر پڑ رہے تھے۔ میری وقعت میری نظروں میں خود بخود گرتی جا رہی تھی۔ میں بار بار یہی سوچتا کہ آج یہ کیا ہو گیا ہے۔ میں تو اپنے بوسیدہ بستر پر لیٹے لیٹے تمام انسانیت کو اپنے قدموں پر جھکا لیا کرتا ہوں۔ اپنی خوابوں میں پہاڑوں کو دھواں بنا کر اڑا دینے کا عادی ہوں۔ میرے دل میں تو آسمان کی بلندیوں میں درخشاں ستارے بھی کسی کسی رات کانٹوں کی طرح کھٹکا کرتے ہیں۔ مگر آج یہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک ایسی

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

سخن فہم

قتیل شفائی

چھوڑیئے اجی حضرت
ان فضول باتوں کو
لائیے بیاض اپنی
اب کوئی غزل ہو جائے

اک ذرا توجہ سے!
ہاں تو نذر ہے مقطع
"زلف ان کے رُخ سے دردد
جب ہٹی تو دیکھیں گے"

کیا غزل ہی سنئے گا؟
لیجئے تو مطلع ہے

. . . .
لاجواب مقطع ہے

جی — ! ہزار بار ارشاد!

کیا غزل پسند آئی؟
کیوں نہیں — اجی واللہ
آپ نے تو حد کر دی

. . . .
"شب کٹی تو دیکھیں گے
پو پھٹی تو دیکھیں گے"
کیا زمیں نکالی ہے

شعر عرض کرتا ہوں
واہ کیا تخیّل ہے
داد ہو نہیں سکتی
ایک بار پھر پڑھئے

شکریہ نوازش کا —!
لیکن اک ذرا صاحب!
میرے چند شعروں کی
آپ شرح فرما دیں

شعر عرض کرتا ہوں
یہ زبان — کیا کہنا
میرؔ یاد آتا ہے
شعر ہو تو ایسا ہو

مجھ سے کچھ کہا ہے کیا؟
میں کچھ اونچا سنتا ہوں
اُف وہ کام دفتر کا —!
جی تو اب بجتے ... ٹاٹا

ممتاز مفتی

شاعر غیر شاعر

ماورا ایک داخلی فنکار کے مسلسل ذہنی ارتقا کی داستان ہے۔ جو شاعر کے خارجی تاثرات سے شروع ہو کر اس کے گہرے داخلی حسیّات کی انوکھی اور بصیرت افروز تصویر پر ختم ہوتی ہے۔ کتاب میں شاعر کی تکمیل کے مدارج یوں واضح ہیں۔ جیسے گلاب کی جھاڑی میں ڈنڈی، پتے اور پھر کلی اور پھول۔ ابتدائی نظموں میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے فنکار رسمی انداز اظہار اور اسالیب بیان کی بھول بھلیوں سے نکل کر کوئی منفرد نغمہ الاپنا چاہتا ہو۔ ان نظموں کی مختلف ہیئتوں کو آزماتے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ نظم کی رسمی ہیئت شاعر کے پیغام کو پورے طور پر اجاگر نہیں کر سکتی۔ اور جذبۂ تخلیق کے جوش میں کبھی وہ یہ سرکنڈا توڑتا ہے۔ اور کبھی وہ کہ اُسے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا سکے۔ اور پھر آخری شاہ پاروں میں ہم وہ نغمہ آزاد نظم کے پردوں پر سنتے ہیں۔ ایک انوکھا دلنواز نغمہ۔

شاید راشد نے بھی اظہار خیال کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ جسے وہ اب اس قدر "درے" سمجھتا ہے۔ کہ "ماورا" شامل نہیں کرتا۔ اگرچہ اُردو شاعری غزل کی مرہونِ احسان ہے۔ لیکن غزل میں ایک وسیع جذبے کا اظہار ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر ممکن بھی ہو تو یہ ہر فنکار کی مرضی پر منحصر ہے۔ کہ وہ جس ہیئت کو اظہار خیال کے لئے مناسب سمجھے۔ اسے اپنا لے۔ اُس نے غزل اور گیت کو آزمایا۔ پھر سانٹ کو پہلی مرتبہ اُردو میں رائج کیا۔ لیکن ان اشکال کی وضعی پابندیاں اس کے پیغام کو جذب کر سکیں اور آخر کار اسے آزاد نظم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

راشد کا پیغام انوکھا ہونے کے باوجود محرم راز سا محسوس ہوتا ہے۔ اور نیا ہونے کے باوجود اس قدر کہنہ جیسے وہ آدم سے لے کر آج تک ہماری روحوں میں گونجتا آ رہا ہو لیکن ہم اُسے واضح طور پر اپنا نہ سکے ہوں۔ راشد کی شاعری کی بنیادی خوبی حقیقت پسندی ہے۔ وہ اپنے آپ سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے ہیئت کی بھول بھلیاں اس کے منفرد عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔ ورنہ شاید وہ اپنے آپ کو اس جدوجہد میں کھو دیتا کسی کنج میں تھک ہار کر بیٹھ رہتا۔ اسے ہی منزل سمجھ لیتا۔ اور شہرت کے جگمگاتے جالے میں پھنس کر تکمیل کے خواب پڑا دیکھتا لیکن راشد کی حقیقت پسندی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اس ابتدائی کشمکش میں یہ امر باعث تعجب نہیں۔ کہ وہ رسمی ہیئت اور خیال کے جال سے کیسے نکل آیا۔ بلکہ حیرت تو اس بات پر ہے۔ کہ اس جدوجہد کے باوجود اس کی انفرادیت پر کوئی آنچ نہیں آئی۔

رسمی نقطہ نظر کو راشد کے جذبات انوکھے اور فرنگیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی اجنبی ذہن کی نقلی تصویر دکھا رہا ہو۔ لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو الفاظ اسلوب بیان اور خیال کی اجنبیت کے باوجود مجموعی طور پر ہر خیال کا جذباتی پس منظر خالص مشرقی ہے۔ اس کا نغمہ نیا سہی۔ لیکن وہ بانسری جو اُسے سرگرفی ہے۔ بندرابن کے کسی مقدس جھنڈ سے مستعار لی گئی ہے۔ اس کا خیال جدید نفسیات کی پیداوار سہی۔ اس کے لاشعور میں فرائیڈ اور سٹکل کے تاثرات سہی۔ لیکن اس کا نقطہ نظر بدھ اور کنفیوشس کی گہرائیوں کا حامل ہے۔ اور شاید یہی امتزاج اس کی نظروں میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا کرنے کا ذمہ وار ہے۔ اسی لئے ہم بسا اوقات اس کے رنگین اور عمیق اشارات کو سمجھے بغیر اس کا کلام سن کر خواہ مخواہ سر دھننا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا ہمارا لاشعور شعوری نافہمی کے باوجود ان بظاہر مہمل مگر رنگین لفظوں کے راز سے واقف ہو۔ یہ حقیقت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ راشد اجتماعی نفس غیر شاعر

کا عکاس ہے۔ وہ لاشعور کا شاعر ہے۔ ورنہ اس کے کلام کی اجنبیت اس کی تصاویر کی نامحرمیت اور اس کے اشارات کی رنگین پیچیدگیوں کی وجہ سے لازمی طور پر اُسے عوام کے نزدیک بعید الفہم یا "اَن سمجھا" شاعر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس سب اُس کو اپناتے ہیں (کوئی جنسی رنگ اخذ کرتا ہے۔ کوئی قنوطی اور کوئی جذباتی) اس کے کلام کا سحر ہم پر چھا چکا ہے۔ اور ہم حیرانی سے اس کا کلام سنتے ہیں۔ اور یہ حیرانی بھی کسی قدر تعمیری ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم آسودگی محسوس کرتے ہیں تشنگی نہیں۔

ہاں تو راشد نفس لاشعور کا عکاس ہے اور اس کی بہترین نظمیں وہ ہیں۔ جنہیں اس کا نفس شاعر۔ لاشعور سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس کی نظمیں "آزاد خیال" کا بے ہنگم تسلسل نہیں۔ وہ ہر آتے جاتے جذبے کو نظم نہیں کرتا۔ بلکہ کسی ذہنی تحریک یا خیال کو لاشعوری طور پر اس شدت سے مرکز توجہ بناتا ہے کہ وہ اپنا راز کھول دیتی ہے۔ اور راشد کا قلم "ان کہی" باتیں کہہ دیتا ہے۔ ہم اسے شعوری وضاحت سے سمجھے بغیر سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں ہمارے احساس برتری کو جھٹکہ سا لگتا ہے۔ اور ہم چونک کر کہتے ہیں۔ کہ شاعری تو خیر مان لیتے ہیں۔ لیکن راشد بیں فرار ہے اس کا کلام قنوطیت سے بھرا ہے۔

یہ امر قابل وضاحت ہے کہ راشد کی داخلی نظمیں اس کے یا کسی ایک کے انفرادی نفس غیر شاعر کی تصاویر نہیں۔ بلکہ ہمارے اجتماعی نفس غیر شاعر کی جھلکیاں ہیں۔ ہمارے ماحول اور موجودہ حدِ ارتقا کے نقوش ہیں جس میں ہماری تاریخ کے خطوط بھی ابھرے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر وہ عام نفسیاتی شاعروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ کسی انفرادی تحت الشعور کی تصویر دلچسپ ہو تو ہو۔ لیکن وہ اس قدر بصیرت افروز اور عمیق نہیں ہو سکتی۔ راشد کے کلام کے عمق اور وسعت میں ہماری صدیوں کی آپ بیتی پنہاں ہے۔ اس کا بیان ہماری روح پر چھا جاتا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں گویا کسی شریر "پنڈورا" نے ہماری گذشتہ تاریخ کا صندوقچہ کھول دیا ہے۔

میری دانست میں راشد کا کلام زندگی سے فرار یا انحراف کا پیغام نہیں۔ اگرچہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ زندگی کی دعوت نبرد آزمائی دیتا ہے۔ وہ مروجہ اور خود ساختہ بندھنوں کے خلاف صدائے احتجاج کے پردے میں آزاد زندگی کی آرزو ظاہر کرتا ہے۔ ان قیود کے خلاف جو ہمارے لاشعور میں گھر کر چکی ہیں۔ جنہیں شعوری طور پر توڑنا تو آسان ہے۔ مگر توڑتے ہوئے ہمارے لاشعور میں ایک ان جانا صدمہ ہوتا ہے۔ ایک خواہ مخواہ کا درد پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک عجیب سا جذبہ پشیمانی بیدار ہو کر ہمیں اپنی نظروں میں قابل نفریں بنا دیتا ہے۔ ہم دل ہی دل میں اپنے آپ کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ہر فنکار کا ایک منفرد شخصیت ہونا لازمی ہے فنکاری کی غایت ایک شدید انفرادیت کی عکاسی ہے راشد کی فنکاری کی خصوصی انفرادیت اظہر من الشمس ہے وہ اس شدت سے منفرد ہے کہ ایک عرصہ سے مختلف نقاد اس کے فن کو سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہیں مگر کسی دو افراد کا نقطہ نظر ہم آہنگ نہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر کے مطابق ہر الہامی آرٹ کا وسیع اور عمیق ہونا لازمی ہے۔ تاکہ تیز سے تیز فہم بھی اپنی بصیرت کے مطابق اس کے معانی کو وسعت دے سکے۔ اور یہ خصوصیت راشد کی داخلی نظموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ چاہے ہم انہیں شاعر کی ذاتی خواہشات کی دھندلی تصاویر سمجھ کر مطمئن ہو جائیں۔ یا ایک قنوطیت سے لبریز بوجھل نقطہ نظر کہہ دیں۔ یا اجتماعی لاشعور کی جھلکیاں سمجھ بیٹھیں۔ یا جنسی معانقہ کی آپ بیتی قرار دیں۔ تاویلوں کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔

نفسیاتی نقطہ نظر کے مطابق فنکاری کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل وہ جس میں فنکار اپنے کردار کا تجزیہ نفسی خود پیش کرے۔ دوم وہ جس میں ذاتی خیال آرائی کے بغیر اپنے کردار کی ذہنی کیفیات کی تصاویر پیش کر دے اور اس کا تجزیہ نفسی ہم پر چھوڑ دے۔ پہلی قسم کو نفسیاتی اور دوسری کو الہامی کہا جاتا ہے۔ نفسیاتی فن زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن موخر الذکر کی طرح ذہنی وسعت اور کشادگی پیدا نہیں کر سکتا۔ یعنی پہلی قسم اُس حسینہ کی سی ہے۔ جسے دیکھ کر ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس کا وجود صرف اسی حد تک ہے

جو ہمارے پیشِ نظر ہے اور بس۔ دوسری قسم اُس خوبصورت عورت کی سی ہے۔ جس کا وجود اس امر کا شاہد ہے۔ کہ ہمارے پیشِ نظر ایک پراسرار اور رمد ہوش کن شخصیت کا ایک ادنیٰ اسا پرتو ہے۔ جو بذاتِ خود اُس ان جانی شخصیت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ راشد کا فن موخر الذکر قسم کا ہے۔ نفسیاتی فن اہلِ فہم کے لئے اسقدر جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اس کے معانی کو اپنی بصارت کے مطابق وسعت نہیں دے سکتے۔ اور ذہنی حرکت کا لُطف حاصل نہیں کر سکتے۔

پیامی شاعر صرف وہی نہیں جس کے کلام میں للکار ہو جو ہمیں جھنجھوڑ کر جگا دے اور عمل پر مائل کرے۔ اگر واضح للکار کا اثر ہمہ گیر ضرور ہوتا ہے اور یہ دعوتِ عمل ایک ساعت کیلئے اہلِ فہم کے بدن پر بھی چیونٹیاں بن کر رینگتی ہے لیکن للکار دوامی اثر پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ بلکہ فنکار دعوتِ عمل کو منزلِ مقصود کی تصویر میں ظاہر کر سکتا ہے یا سوسائٹی کی موجودہ تہی دستی اور جمود کے بیان میں یا مروجہ نظام سے فرار کی ترغیب میں اور یا غلامانہ ذہنیت کے خلاف صدائے احتجاج میں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ للکار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ محض للکار میں فہمی حرکت اور وسعت مفقود ہے۔ راشد کی داخلی نظموں میں عوام کو بیدار کرنے والی للکار نہیں۔ لیکن اہلِ فہم کو چونکا دینے کی صلاحیت کے علاوہ عوام کے لاشعور میں ایک ان جانا اثر پیدا کرنے کی قوت ضرور ہے۔

ویسے تو ہم کسی دو شاعروں کے کلام کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر فنکار کے ذہنی تاثرات مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف درجے سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ قسم سے شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کہ ہر فنکار کا تخیلی ماحول ہی علیحدہ ہوتا ہے؛ اگرچہ بنیادی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اقبال نے گذشتہ اسلامی عظمت کے بیان میں ایک للکاری اپیل پیدا کی۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق وہ سوشل نظام جو کبھی مسلمانوں نے رائج کیا تھا۔ ہماری سوسائٹی کو آسودگی، آزادی اور بہتر زندگی بخش سکتا ہے۔ لیکن اس کے نکتہ رس فہم کو یہ للکار پورے طور پہ جذب نہ کر سکی۔ اور اپنی ذہنی تشنگی کو مٹانے کے لئے اُسے فلسفہ کی گہرائیوں میں پناہ لینا پڑی۔ ٹیگور کے کلام میں جذبات کی وسعت اور گہرائی کی اپیل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا پیغام فطری زندگی کے محاسن اور سوسائٹی کے موجودہ جمود۔ سطحیت اور کھوکھلی بہروپیہ تہذیب کے موازنہ میں پنہاں ہے۔ ترقی پسند فنکار اپنی للکار کو سامراج کے مظالم اور قبیح نتائج کی تصاویر میں نمایاں کرتا ہے۔ اور سوسائٹی کے چہرے کی چھائیوں اور پھنسیوں پر انگلی رکھ کر ہمیں جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور راشد اجتماعی نفس غیر شاعر کی جھلکیاں دکھا کر ہمیں ان پابندیوں کے خلاف اُبھارتا ہے۔ جو ہمارے لاشعور میں گھر کر چکی ہیں۔ اس کی دعوتِ بیداری عُریاں نہیں۔ بلکہ ان جھلکیوں میں مستور ہے۔ جو ایک شدید ذہنی تحرک کی حامل ہیں۔

ہمارا یہ کہنا کہ فیض کا کلام راشد کے کلام سے بہتر ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اگرچہ بنیادی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ راشد کے کلام کی اپیل ہمہ گیر ہے۔ لیکن اس کی فہمی قبولیت صرف اہلِ فہم تک ہے۔ اس کے برعکس فیض کے کلام کی اپیل بھی ہمہ گیر ہے۔ اور فہمی قبولیت بھی کیوں کہ اس کے کلام کا موضوع جذبات ہیں۔ جو بذاتِ خود ایک ہمہ گیر موضوع ہے۔ فیض میں وہ فہمی تحرک نہیں جو راشد میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اگر فیض کے کلام کی فہمی قبولیت ہمہ گیر ہے تو اہلِ فہم کے لئے راشد کا سحر ابدی ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو ہم نے ہر نئے پیغام سے متاثر ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اور ہم ایک جنون کی سی کیفیت کے ساتھ ادبِ جدید کے متلاشی ہیں۔ ہم پرانے دیوتا۔ پرانے انداز۔ پرانی قدروں۔ پرانے اسالیب اور پرانے نکات سے برگشتہ ہیں۔ لیکن ایک نئی چیز کو دیکھ کر ہم اسے پرانے معیار سے پرکھتے ہیں۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اس میں تعجب کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت بذاتِ خود اس امر کی شاہد ہے۔ کہ ہماری شعوری خواہشات کے باوجود ہمارے جذبات کا تار پود وہی پرانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح زبان کی وسعت کا دارومدار گرامر کے اصولوں پر نہیں۔ بلکہ زبان کی وسعت پر گرامر کے اصولوں کی داغ بیل رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح

تنقیدی اصول بھی ادب اور فن کے موجب نہیں۔ بلکہ فنی اور تعمیری حس نے ہی تنقیدی حس کی تخلیق کی ہے اور اول الذکر کی وسعت اور تبدیلی کے بعد وجود میں آتی ہے۔ یعنی یہ ایک ضمنی چیز ہے۔ اگر ہم اپنے جدید فنکاروں کے پیغام کو پورے طور پر پرکھ نہیں سکتے۔ تو تعجب کا مقام نہیں۔ کیونکہ ہر وہ پیغام (جس کی نوعیت واضح ہو۔ پرانے جذبات اور خیالات سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے موجودہ جذبات اور احساس قدر دانی (APPRECIATION) پر ابھی اسی خانہ ساز کا اثر ہے۔ جس کی مستی ہمارے نفس غیر شاعر پر عرصہ سے چڑھی ہوئی ہے

جیمز" نے اس حقیقت کی یوں وضاحت کی ہے کہ :-

"ہر نئی حقیقت لازمی طور پر روایات سے تعلق رکھنے والی ایسی کڑی ہے۔ جو تبدل کی اجنبیت کو ہموار کرتی ہے۔ اور کہنہ اعتبار دل اور نئے خیالوں کے درمیان ایک ایسا جوڑ بن سکتی ہے کہ ذہن کو خفیف ترین جھٹکا لگے اور ممکن ترین روانی قائم رہے۔

عموماً ایسے انوکھے حقائق رد کر دیے جاتے ہیں جنہیں قبول کرنے کے لئے ذہن کے روایتی اور بنیادی عقیدوں کو از سر نو نظم کرنا پڑے۔ یا ان میں بنیادی کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہو۔ اور انہیں پیش کرنے والوں یا اُن کی حقیقت کی شہادت دینے والوں کو صلواتیں سنائی جاتی ہیں"

جیمز کا یہ قول قطعی طور پر صحیح ہے۔ گو ضمنی طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر خوش کن خیال کو اپنانے اور تسلیم کرنے کی خواہش ہم پر اس قدر حاوی ہے کہ روایتی اعتباروں اور عقیدوں کے تضاد کے باوجود ہم اسے اپنا لیتے ہیں۔ چاہے اس کی شمولیت سے پرانے اعتباروں اور عقیدوں کو تقویت ہو یا نہ ہو۔ چاہے اسے قبول کرنے پر ہمیں اپنے ذہنی عقیدوں کو تہس نہس ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ہم اس نئے خوش کن خیال کو بھی اپنا لیتے ہیں۔ اور پرانے ذہنی عقیدوں کو بھی جوں کا توں قائم رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارا ذہنی پس منظر فقیر کی گدڑی کی طرح ہفت رنگ ہو جاتا ہے اور ہماری شخصیت کبوتر خانہ، جس میں مختلف اور متضاد عقائد اور اعتبار ڈربوں کی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ اور دور رہ کر ہمیں ایک مجموعہ اضداد بنا دیتے ہیں۔ شاید اسی لئے موجودہ زبوں حالی کی عکاسی کرنے والے فنکار پر یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ کہ وہ قنوطیت کا شکار ہے اور آنے والے "گولڈن ایج" کی دلآویز تصویر دکھلانے والے کو الہامی فنکار سمجھا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے آجکل انقلاب پسند اور جمہور پسند کو ترقی پسند کہا جاتا ہے۔ اور ایسے فنکار آج کل کا فیشن ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ایسے فنکاروں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ ان کا فن ایک ایسی شمع ہے۔ جس کے ہم سب مرہون احسان ہیں۔ لیکن حقایق پسند فنکاروں پر قنوطیت عائد کر کے انہیں متروک قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کہ انسان سی نحیف مخلوق کو (میں انسان کا موازنہ دوسری مخلوقات سے نہیں کر رہا بلکہ فطرت کی ہمہ گیر قوتوں سے) کسی نہ کسی آسرے کی ضرورت ہے۔ آجکل کے سرمایہ دارانہ نظام تلے کچلی ہوئی اکثریت کو امید افزائی کی حاجت ہے۔ اس حیاتیاتی اصول (دکھ سکھ کے مقابلے میں ایک عمیق تر اور حاوی حقیقت ہے) کی ہمہ گیری سے بچنے کے لئے ہم سب خوش کن گیتوں کا الاپ سننا چاہتے ہیں۔ اور ہر سرور انگیز پیغام کا اچھل کر خیر مقدم کرنے پر مجبور ہیں۔ چاہے وہ سراب ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ فطرت انسانی کی حقیقی تصویر پیش کرنا ہی فن ہے۔ چاہے وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا فن جو کسی صورت میں بھی راحت افزا پیغامات سے کم اثر انگیز نہیں۔ ایک ایسا فن جس کی اہمیت لازوال ہے کارل مارکس ایک زبردست مفکر سہی لیکن اس کی عظمت این سٹائن۔ برگسان۔ نٹشے۔ جیسی نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ اس کے فکری فلسفہ نے ایک ایسے جدید ترین اور عظیم الشان ادب کی داغ بیل ڈالی جو شاید مؤخر الذکر علماء کو نصیب نہ ہو۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کبھی کبھار شبہ سا پڑتا ہے۔ کہ فطرت انسانی کے لئے موجودہ رجحت

اس قدر مسرت خیز نہیں جس قدر پیغام راحت کے تاثرات یا کسی گذشتہ راحت کی یاد۔ اور اقتصادی خوشی تکلیف یا دکھ کی عدم موجودگی کی غماز ہے۔ جب راشد یہ کہے:۔

اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی!!! ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نئی لرزش ہویدا ہو چلی!!! گوشۂ زنجیر میں!!

تو ہم سب اٹھ بیٹھتے ہیں اور راشد کے اس "نمایاں ذہنی انقلاب" کا استقبال کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے کان راشد کے منہ سے ایک ایسے ہی مژدہ جانفزا سننے کے لئے ترس رہے تھے —— لیکن یہ نقطہ نظر راشد کے تمامتر کلام کو جھٹلا رہا ہے۔ کیونکہ راشد کے نزدیک آزادی ایک داخلی وصف ہے۔ جسے کسی بیرونی گوشۂ زنجیر سے تعلق نہیں —— مجھے یقین ہے کہ راشد سا حقیقت پسند خود بھی اس بات کا شعور رکھتا ہے۔ کہ درحقیقت شبخون مارنے والوں کے دل بھی اسی طرح "تاج، ملوکیت کے لئے ترس رہے ہیں۔ جس طرح "گولڈن ایج" کی آمد کا ڈنکا بجانے والا اپنے جمہوری پیغام کے باوجود گولڈ کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکا ——

اور اس کے برعکس جب راشد کہے:۔

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھکو — کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا

تو ہم کہتے ہیں "ہاں یہ ہے۔ فرائڈ کے نظریہ تحت الشعور کا شاعرانہ اظہار" یا "بے چارہ آپ بیتی سنا رہا ہے"۔ حالانکہ یہ وہ گوشۂ زنجیر ہے۔ جس میں لرزش پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اور شاید اس حقیقت کا اظہار ہے۔ جو لرزش پیدا ہونے میں حارج ہے لیکن اسے پڑھ کر ہم کتاب بند کر دیتے ہیں۔ اُف! کس قدر قنوطیت ہے راشد میں۔ درحقیقت ایسی سطور کے پیغام میں ایک آن شدت ہے۔ جیمز کی پیش کردہ حقیقت کے مطابق راشد کے کلام میں اس قدر جدت ہے۔ کہ وہ ہمارے موجودہ اعتباروں کی مالائیں پرویا نہیں جاسکتا۔ اس لئے ہم اس کے پیغام کی حقیقت سے نہ تو واقف ہو سکے ہیں۔ اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اسے یک قلم رد نہیں کرتے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اپنا محل ان حقائق پر تعمیر کرتا ہے۔ جو پرکھے جاچکے ہیں۔ اس لئے کوئی ذی فہم راشد کے حیات کی حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ —— چونکہ اس کا پیغام براہ راست ہمارے لاشعور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ہم مبہم طور پر اس کی اپیل محسوس کرتے ہیں۔ اور سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کسی واضح للکار کے بغیر وہ ہم سب پر چھا چکا ہے۔ اور یہی اس کے الہامی اور ساحرانہ فن کا ثبوت ہے۔ راشد کی داخلی نظمیں اس قوم کی نفسیات کی تصاویر ہیں، جسے غلامی، رسم و رواج، روایتی مذہب، خدا اور جھوٹے ضبط و تقدس نے اپاہج کر رکھا ہے Psychology of a Suppressed People سب سے پہلے راشد نے خود ساختہ اور مروجہ بندھنوں کے خلاف آواز اٹھائی پھر فرنگی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ جو ہماری غلامانہ ذہنیت اور ذہنی کبڑے پن کے وجود کے اسباب میں سے ایک ہے۔ اور آخرکار فطرت کے اس رنگین پھندے کی شکایت کی۔ جسے عورت کہتے ہیں۔ اور قدرت نے مرد کو پھنسانے کے لئے بنایا ہے۔ (اگر اس کی ابتدائی نظمیں عورت کی آرزو سے بھری پڑی ہیں۔ اور جو فنکار کے تخلیقی کام میں ہمیشہ رکاوٹ کی طرح حائل ہے۔

"انتقام" میں راشد نے تحت الشعور کی ایک رنگین تصویر دکھائی ہے۔ جس میں اُن حقائق کو واضح کیا گیا ہے۔ جو ہمارے موجودہ ذہنی کبڑے پن کے بنیادی اسباب ہیں۔

ایک وسیع ایوان۔ ایک طرف آتشدان (منبع قوت و حرکت) سنگین دیواروں کا پس منظر اور ان پر ان روایتی دیوتاؤں کے بے حس مجسمے جو صدیوں سے ہمارے ذہن پر آکاس بیل کی طرح سوار ہیں۔ اور منبع قوت و حرکت پر خندہ زن ہیں۔ ادھر آتشدان میں دبی دبی مگر چیختی ہوئی آگ جو اپنی بے بسی اور ان کی بے حسی پر پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ پھر فرنگی تہذیب کی اونچی اونچی، اجلی اجلی پھیلی ہوئی دیواریں۔ اور ان پر اُن

فرنگی حاکموں کی شبیہیں جن کے مظالم کی داستان ہر اینٹ پر خون سے لکھی گئی ہے۔ اور جن سے یہ سامراجی ایوان حکومت تعمیر کیا گیا ہے ایسے لاشعوری تاثرات کے ہوتے ہوئے کسی فرنگی عورت سے پیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— اس کے خدوخال کو دیکھنا یا یاد رکھنا بے معنی ہے۔ راشد کا یہ "انتقام" نفسیاتی حقیقت ہونے کے علاوہ ایک حسین اور رنگین مرقع بھی ہے۔

ہماری نفسیت اس قدر خمیدہ ہو چکی ہے۔ کہ اُس میں نمو اور روئیدگی کی طاقت ہی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ ہمارے لئے خوشی یا لذت اثباتی نہیں۔ بلکہ منفی جذبہ بن چکی ہے۔ ہم میں جنسی لذت کے حصول کی اہلیت ہی نہیں۔ اگرچہ اس کی خواہش ہماری شخصیت پر یوں سوار ہے۔ جیسے جزیرے کا بڈھا سندباد کی گردن پر۔ ہمارے نزدیک جنسی ملاپ اسی حصول لذت نہیں بلکہ زندگی کے حقائق سے فرار اور انہیں بھولنے کی کوشش ہے۔ جیسے بسا اوقات شراب مستی کی لذت حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ کسی غم کو بھلانے کے لئے پی جاتی ہے۔ یا اکثر ہم اپنے آپ کو کھونے کے لئے مطالعہ میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یعنی مطالعہ ہمارے نزدیک محض ذریعہ ہوتا ہے غایت نہیں۔ اسی طرح عام طور پر ہمیں جنسی ملاپ میں بھی زندگی کے ملحق حقائق سے وقتی پناہ ملتی ہے۔ اور بس ———

راشد اس حقیقت کا اظہار "رقص" میں کس دلآویز انداز سے کرتا ہے۔ رقص جنسی نشاط کا اک رنگین کنایہ ہے۔ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے And ply the Twofold Dance سے کہیں رنگین تر ہے۔ ہم رقص ایک اجنبی رقاصہ ہے۔ زندگی سے پناہ لینے کے لئے ہم اُس کے ہاں جاتے ہیں۔ ڈر سے بھاگتے ہوئے۔ لرزاں روایت کا یہ پالک ہمارا ضمیر خوشی یا لذت کو احساس گناہ اور پشیمانی کے بغیر تصور میں نہیں لا سکتا۔

جنسی ملاپ کی تشبیہ چکی سے دینا۔ جس کے دونوں پاٹوں تلے کلفتوں کے سنگریزے پسے جا رہے ہیں۔ کتنا منفرد ہے اور پھر چکی پیسنے میں غلامی اور مظلومیت کا اشارہ فنکار کے فن کی مخصوص بلندیوں کا غماز ہے۔

رقص کی یہ گردشیں، ایک مبہم آسیا کے دور ہیں، کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں، کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے۔

نفسی خدشات کی مدافعت، شدتِ لمس سے کی جا رہی ہے اور ہم اس اجنبی عورت کی آغوش میں ہمدردی کے متلاشی ہیں اس کے جسم کی گرمی ہمارے نڈھال بدن میں تحرک پیدا کرتی ہے۔ اُس کے بدن کی بے زبان لوری ہمیں تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ اُس بظاہر زبردست جسم کا لمس ہمارے احساس کمتری کو وقتی طور پر شل کر دیتا ہے۔ اور ہمارے لئے ایک رنگین برتری کا وہ شراب پیدا کر دیتا ہے۔ جو ہماری انانیت کو یوں پالتا پوستا ہے جیسے ماں بچے کو اور جس سے ہم سہمے جانے کا جواز اخذ کرتے ہیں ؎

جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں — زندگی بھر میں جھپٹ سکتا نہیں

ان دو سطور میں فنکار نے غلامانہ ذہنیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اور مظلوم افراد کی سفاکی اور وحشت کی شدت کا راز کھول دیا ہے۔ ہر مظلوم شخص اپنی مظلومیت اور بے بسی کو بھولنے کے لئے کسی بے بس تر فرد (جو اُس کے زیر اثر یا اقتدار ہو) سے احساس برتری حاصل کرنے کے لئے انتہائی سفاکی اور وحشت سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ان دو سطور سے ہماری خانہ زاد یعنی ہندوستانی عورت کی غلامی و مظلومیت اور ہندوستانی مرد کی شہوانیت و وحشت کا راز فاش کر دیا ہے۔

تقاضہ تو ایک طرف رہی ہمارے لئے وصل محبوب بھی درحقیقت ایک صورت فرار ہے۔ اگرچہ اس میں اس قدر وحشت نہ سہی۔ پھر بھی غلام کی محبت میں بلند ہمتی احساس ہمدردی اور کشادگی نہیں ہو سکتی۔ جلد ہی محبت ایک ایسی شکل پیدا کر لیتی ہے جس پر جنسی انحراف

کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ بہر حال ایسے ملاپ میں بھی فرار کا عنصر حصول سے کہیں زیادہ ہے۔ فنکار نے ایک رات بن کیسے حسین الفاظ سے یہ حقیقت واضح کی ہے:۔

غم کا بحرِ بیکراں ہے یہ جہاں ...... میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے ...... سطحِ شور انگیز پر اس کی رواں ...
... ایک ساحل ایک انجانے جزیرے کی طرف ...... اس کو آہستہ لئے جاتا ہوں میں ...... دل میں یہ جاں سوز وہم ...... یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے ——

یہاں سنگریزے بجرِ بے کراں ہو گئے ہیں اور چکی کے پاٹ۔ ناؤ اور کھویا۔ ناخدا یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو پار لگانے کے لئے مشقت نہیں کر رہا۔ بلکہ ناؤ کو بچا بچا کر ساحل پر لئے جا رہا ہے۔ شاید یہ ضمنی احساس بھی ایک حقیقت ہو راشد کی یہ تشبیہ کس قدر رومان بھری تصویر ہے۔ اور پھر ساتھ ہی کتنی زبردست حقیقت نمائی۔ کیونکہ غلامانہ ذہنیت کے حامل بھلا محبت کی حقیقت کو کیا سمجھیں گے۔ ہمارے لئے محبت تو "ضبطِ تحریکِ جنسی" کا ایک پر سرور عمل ہے۔ ہمارے بھوکے نفس کی اک پکار۔

جھوٹے ذوقِ تقدیس اور "ضبطِ تحریکِ جنسی" پیدا کرنے والے کہنہ اور رواجی اخلاق نے ہماری نفسیت پر امر بیل کی طرح چھا کر ہماری شخصیت کو ایک پژمردہ اور بے برگ و بار درخت کا سا روپ دے دیا ہے۔ ہماری روح اور جسم کے ربط کو توڑ کر ہمیں تماشا بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ ہم مجموعۂ اضداد بن کر رہ گئے ہیں۔

"حزنِ انسان" میں فنکار نے شدتِ ضبط کے قبیح نتائج پر روشنی ڈالی ہے:۔

آہ! انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی ...... حسن بے چارے کو دھوکا سا دیے جاتا ہے ...... ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن "حسنِ کل" کا ایک پرتو ہے۔ اس لئے اسے حسنِ کل کی طرح پاکیزہ ہونا چاہیے۔ ہم ہر حسینہ پر تقدس عائد کر کے اُسے اپنی حقیقت کے اظہار سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اظہار عورت کے لئے فطری طور پر لازمی خصوصیت ہے۔

"التفات" میں بھی شاعر اسی امر کی وضاحت کرتا ہے۔ راحت اور خوشی ایک معصوم جذبہ ہے تو پھر اسے روایتی خدا نے کیوں ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ خاکی مخلوق کے لئے جسم کی اہمیت ہمہ گیر ہے اور لذتِ جسمانی کا حصول روح کی شگفتگی ——

اگر یزداں کا یہی مقصد ہے کہ ہم گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیں۔ تو ہم بھی کیوں نہ اس بے معنی حکم کے خلاف احتجاج کریں:۔

صبح رس لینے کو جب باغ میں زنبور آئے ...... شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں ...... اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے۔

"شاعرِ درماندہ" میں بھی شاعر پھر اُسی حقیقت کا اعادہ کرتا ہے:۔

تو مسرت ہے مری تو مری "بیداری" ہے ...... مجھے آغوش میں لے ...... "دو انا" مل کے جہاں سوز بنیں ...... اور جس عہد کی ہے تجھکو دعاؤں میں تلاش ...... آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے

وہ مسرت جس کی ہمیں حاجت ہے۔ دعاؤں میں نہیں ملے گی۔ بلکہ ایک بشری ربط پیدا کرنے سے حاصل ہوگی۔ "دو انا" مل کر دنیا پر چھا سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں طلسمِ جاوداں کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:۔

زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے !
مجھ کو اپنی رُوح کی تکمیل کر لینے بھی دے !

درحقیقت ان تمام نظموں میں شاعر کو اس تنہائی کا شدید احساس بے قرار کر رہا ہے۔ جو افراد پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر فرد اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ کسی دوسرے فرد کے جذبات اور خیالات کو سمجھنا قطعی ناممکن ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار ہمیں کسی کے دل کے کسی ایک پہلو پر ایک ہلکی سی روشنی پڑتی ہوئی دکھائی دے بھی جاتی ہے۔ لیکن پھر وہی گھٹاٹوپ اندھیرا۔ راشد کے نقطہ نظر سے جسمانی معانقہ سے دوسرے فرد کے دل کی جھلکی سی نظر آتی ہے۔ اور وہ اس جھلکی کا طالب ہے۔ جو ایک لمحہ کے لئے اس چھائی ہوئی تنہائی کے سیاہ آسمان پر بجلی کی چمک پیدا کر کے گرد و پیش کا دھندلا منظر دکھانے میں مدد دے۔

اس عائد شدہ ضبط سے بے ربطی جسم و روح پیدا ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہمارے فکر اور عمل دو مختلف راہوں پر چلنے لگتے ہیں۔ برسوں کے عائد شدہ جسمانی قیود نے ہمیں بیمارانہ لذت تخیل کا محتاج بنا دیا ہے۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ محبوبہ کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں تخیلی محرک پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہمارے دل میں کوئی ولولہ اٹھتا ہی نہیں۔ یعنی یہ تخیلی محرک جو ایک ذریعہ یا Subsettute تھا۔ اب غایت بن چکا ہے۔ یہ ذہنی انحراف ہم میں بے حد عام ہے۔

"بے کراں رات کے سناٹے میں" راشد اس کا اظہار یوں کرتا ہے :-

جذبۂ شوق سے ہو جانے اعضا مدہوش + اور لذت کی گرانباری سے + ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی

محبوبہ کے ہوتے ہوئے بھی ہم تخیل کے محتاج ہیں۔ تاکہ ولولہ پیدا ہو۔ اور پھر اس تخیلی ولولے کی شدت ہی ہمیں ناکارۂ عمل کر دیتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ تخیلی لذت ہمارے لئے نشہ سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت بیچارگی کا احساس ہمیں اس "لذت انانیت" سے لطف اندوز ہونے نہیں دیتا۔ ہمیں محبوبہ سے ڈر لگتا ہے اور ہم اُسے "شکاری" سمجھ کر فرار کی شدید خواہش کے زیر اثر سمٹنے لگتے ہیں۔ ڈرنے لگتے ہیں۔

خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے — اپنے پر تولتی ہے چیخنی ہے

اور پھر محبوبہ کی حالت بیان کرنے میں شاعر کی تشبیہ اپنی مثال آپ ہے۔

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں — ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

مرد کے اس جذبۂ فرار میں عورت کی مظلومیت کی داستان کا بیان روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ ان رنگین تشبیہات میں بھی راشد کا لاشعوری احساس تواریخ جھلک دکھائے بغیر نہیں رہ سکا۔ سینے کے خیال سے اہرام مصر اور پھر داروغہ کے چابک تلے رینگتے ہوئے کراہتے ہوئے حبشی غلام۔ یہ تصویر قوت بیان سے اس قدر چھلک پڑی ہے۔ کہ صرف یہی ایک شعر راشد کو ابدی اہمیت اور شہرت دینے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔

فنکار کی بے پناہ ہمدردی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف مرد کا عملِ فرار اس کی مظلومیت کا آئینہ داری کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ بذاتِ خود محبوبہ کی مظلومیت کا سبب بن گیا ہے۔

دوسرے بند میں جنسی ضد کی تصویر ملاحظہ ہو۔

اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں

ایک طرف تو عورت قدرت کے ہاتھ کٹ پتلی بنی ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف تسخیر مرد کے لئے ایک رنگین جال بھی جبھی تو مرد

اپنی محبوبہ میں اکثر ایک ان جانی اجنبیت محسوس کر کے چونک اٹھتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے۔ جیسے یا وہ کسی دُور دیس کی رہنے والی ہو۔ گویا اس کا قرب اور آرزو مرد کے "انا" کے لئے موت کا پیغام ہو۔ مرد کی شخصیت کی نمو اور روئیدگی کو روکنے یا منحرف کرنے کا ایک ذریعہ ہو۔ اس مقام پر شاعر "عورت" اور "انانیت" کی دائمی تکرار کی وضاحت کر رہا ہے۔ ایسی دقیق سچائی کو قلم کی ایک جنبش سے واضح کر دینا تخیل اور حقیقت۔ محبت اور انانیت۔ جسم اور روح کے تضاد کو چند رنگین لفظوں میں ادا کر کے ہمارے نفس کی اتھاہ گہرائیوں کا راز کہہ دینا کسی عام فنکار کا کام نہیں۔

فنکاری بذاتِ خود فرار ہے لہ اگرچہ آرٹ زندگی سے فرار کا پیغام نہیں دیتا) اگر ایسا نہ ہو تو فنکار کو جینے سے اسقدر فرصت بھی نہ ملے۔ کہ وہ فن کاری کی طرف توجہ دے سکے۔ اور اس طرح دنیا میں سب سے بڑا فنکار عام طور پر وہ عورت ہوتی جس کی شخصیت کا بند تو ایک بے پناہ جاذبیت کا پیغام ہے۔ اور اس کا فن حسین و جمیل زندگی میں جینے پر محدود ہوتا۔ کیونکہ جینے کا رنگین عمل فطرتاً صرف عورت ہی کا حصہ ہے۔

راشد کی نظموں میں عام طور پر عورت کے ساتھ اجنبیت کا احساس یوں منسلک ہوتا ہے۔ جیسے پھولوں کے ہار میں تاگا۔ شاعر کا یہ احساس دیکھ کر مجھے نہ جانے کس عالم کا قول یاد آیا کہ

"کسی عورت سے اس قدر مختلف اور متضاد اور کوئی چیز نہیں۔ جتنی وہ بذاتِ خود اپنے آپ سے۔ عین اس وقت ہمیں پختہ یقین ہو جاتا ہے۔ کہ ہم نے اسے پورے طور پر سمجھ اور پا لیا ہے۔ وہ ہماری انگلیوں سے پھسل کر ہماری گرفت سے نکل جاتی ہے۔ اور پھر قطعی اجنبی بن کر ہمارے روبرو آ کھڑی ہوتی ہے"

"شرابی" میں فنکار نے یہ حقیقت بیان کی ہے۔ کہ ہمارا عیش تو محض ایک فرار ہے جسے عیش کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اور شراب مستی نہیں بلکہ اندھے کی لاٹھی کے مصداق اک آسرا ہے۔ کیونکہ اس کا نشہ تمام نشوں سے زیادہ واضح ہے۔ اس لئے ہم اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ رواجی اخلاق کا یہ تقاضہ ہے۔ کہ پردہ داری روا رکھی جائے۔ پردے کی اوٹ میں ہم جو جی چاہے کریں۔ یا تو یہ ہمارے رسمی اخلاق کی ستم ظریفی ہے۔ اور یا امرا کا پیدا کیا ہوا بہانہ۔ ورنہ درحقیقت غریبوں پر ظلم کرنے کا نشہ۔ دولت اکٹھا کرنے کی مستی اور حکومت کا خمار، شراب کے نشے سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔

"دریچے کے قریب" اور "اجنبی عورت" شاعر کے ملے جلے داخلی اور خارجی تاثرات کی رنگین تصاویر ہیں۔ موخر الذکر میں "عابدشدہ ضبطِ جنسی" کے نتائج کی شکل ملاحظہ ہو۔

یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند — یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزؤں کی ایک — مشتعل بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم

غلاموں کی خانہ زاد یعنی ہندوستانی عورت حقیقی مسرت کی اہلیت کھو بیٹھی ہے۔ اور اس کی مسکراہٹ، اس کی دودھاری مظلومیت کی آئینہ دار ہو کر زہر خند بن چکی ہے۔ اور سامراجی رتھ کے پہیوں تلے کچلے ہوئے مزدوروں کی مظلومیت شدتِ انتقام سے آنکھوں میں گرسنہ آرزؤں کی رو کی بن گئی ہے اور آخری سطور میں مغربی تمدن کا وہ چلتا ہوا جھکڑ!۔ اور اس کی زد میں مشرقیت کا چراغ جو کبھی ہماری عظمت کی روشنی دُور دُور تک پہنچاتا تھا۔ چراغ گور بن کر جھلملا رہا ہے۔

اول الذکر نظم میں راشد نے ملاؤں کے تخلیق کردہ رواجی مذہب اور خدا کی تصویر کھائی ہے اگرچہ وہ خدا موجودہ سوسائٹی میں ایک بے معنی نقش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور شاید اسی لئے وہ ایک منتقمانہ سرگرمی اور جنون سے اپنے خود پیدا کردہ خدا اور مذہب سے یوں چمٹا ہوا ہے۔ جیسے ڈوبتا ہوا تنکے سے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ اپنے گرد و پیش پھیلائے ہوئے زہریلے اثرات کی ہمہ گیری کو دیکھتا ہے۔ تو طبیعت میں ایک اطمینان محسوس کر کے اونگھنے لگتا ہے

اپنے بیکار خدا کے مانند — اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں — ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت اداس — تین سو سال کی ذلت کا نشاں — ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی —

"دریچے کے قریب" کے تیسرے بند میں وہ غلامانہ ذہنیت کے افراد کی جھلک دکھلاتا ہے۔ اور ملاحظہ ہو کہ یہ تصویر کس قدر واضح اور پُرتاثیر ہے

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم + بے پناہ سیل کے مانند رواں + جیسے جنات بیابانوں میں + مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشہ میں + ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے + ٹمٹاتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل + لیکن اتنی بھی توانائی نہیں + بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالا بنے + ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں + زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں +

مکافات میں "عائد شدہ ضبط" کے فلسفے کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو ایک تلخ مگر دلآویز مطالعہ ہے۔ شاعر کے خیال میں رواجی تقدس محض ایک پردہ ہے۔ جو ہماری عقل پر ڈالا گیا ہے۔ اس ضبط کا جوابی عمل کس قدر تباہ کن ہے۔ ہمارا انحت الشعور ان دبائی ہوئی، رکی ہوئی خواہشات سے بھرا پڑا ہے۔ جن سے ہماری زندگی زہر آلود ہو چکی ہے۔ اس ذہنی کشمکش سے تنگ آ کر شاعر کہتا ہے:۔

اے کاش! چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا۔ حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

"گناہ میں راشد ان فطری رجحانات کا ذکر کرتا ہے۔ جو تقاضائے فطرتِ بشری ہیں۔ اور جو فوری تحریک کی شکل اختیار کر کے ہمارے شعوری ضبط کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اور پھر ہماری بیداری کس قدر تلخ ہوتی ہے۔ اور ہماری حالت کس قدر مضحکہ خیز۔

ہوش آیا تو میں دہلیز پہ افتادہ تھا -- خاک آلودہ و افسردہ و غمگین و نزار

میرے خیال کے مطابق یہ مخصوص گناہ جس کی طرف شاعر اشارہ کر رہا ہے۔ ہر فنکار کی بڑھی ہوئی "انانیت" کا ایک لازمی جزو ہے جو منفرد فکر و تخیل سے یوں وابستہ ہے۔ جیسے سر سے سودا۔ اور جس کے وقوع پر "گنہگار" کی معصومیت انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ (شاید اس وقت فطرت اس کی حیرانی پر معنی خیز انداز سے مسکرا دیتی ہو) یہ ازلی تحریک ایک ایسا شیطان ہے۔ جس کی پیدا ہو جانے کی بے پناہ طاقت اسی رواجی خدا کی بے بسی پر دال ہے۔ جسے روایتی اخلاق نے تراشا ہے۔

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا -- بے بسی میرے خداوند کی تھی!

"خودکشی" میں راشد اعلیٰ آرٹ کی بلندیوں پر پہنچا ہوا ہے۔ اسی لئے یہ نظم بے حد گہری اور پیچیدہ ہے۔ بہر حال میرے نقطۂ نظر کے مطابق اس نظم میں "فنکار" اور "عوام" کی زندگی کا موازنہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں کہیں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ فنکاری بذاتِ خود زندگی سے انحراف کے مترادف ہے عجب تماشا ہے۔ کہ ہم بذاتِ خود زندگی سے اس قدر متاثر نہیں ہوتے۔ جس قدر اس کی فنی تصاویر سے کیونکہ زندگی سے متاثر ہونا صرف مخصوص اصحاب کا حصہ ہے جنہیں فنکار کہا جاتا ہے۔ ہمارے لئے زندگی کی بھیڑ ایک ایسا پردہ ہے۔ جس کی اوٹ میں حقائق چھپے رہتے ہیں۔ جنہیں کہ ایک فنکار انہیں مبالغہ آمیز وضاحت سے پیش کر دیتا ہے۔

فنکار کے احساسات ازلی طور پر عوام سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سے صرف اپنا جی نہیں لبھاتا۔ تماشائی بنتا ہے۔ تماشا نہیں۔ یہ خصوصیت بذاتِ خود انحراف ہے۔ فنکار کی انفرادیت کی شدت بھی انفرادی ہوتی ہے۔ اس کے احساسات میں کوئی عام فرد شریک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جہاں تک ہمدردی کا تعلق ہے۔ زندگی کی بھیڑ فنکار کے لئے ایک ہنگامہ خیز تنہائی اور ویرانی سے کم نہیں۔ یہ ویرانی اور تنہائی اس کی انانیت کو اور بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ اور جوابی طور پر یہ تقویت اُسے قعرِ تنہائی کی مزید گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ اور عمل کا یہ چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

ایک فنکار کی دنیا اس کی اپنی انانیت کی لامحدود وسعتیں ہیں۔ جو اُسے عوام کی سی زندگی سے لطف اندوز ہونے سے محروم کر دیتی ہیں۔ "خودکشی" میں شاعر اپنی انانیت کی تنہائی سے اکتا چکا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے۔ کہ وہ عوام بھی عوامی زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہو۔ عوام کے رنگین جذبات سے حظ حاصل کرے۔ ایسے جذبات جو صرف لذت پیدا کرتے ہیں۔ تخیل اور فکر سے مبرا جذبات۔ چونکہ تخیل اور فکر جذبات کے بہاؤ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور معانی کے لطف کو فنا کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس کی خواہش ہے کہ وہ

(باقی صفحہ [illegible])

رفیق علی خان

بلی

افراد -

امّی	
نسیمہ	بڑی لڑکی
بلی	منجھلی لڑکی
رشیدہ	چھوٹی لڑکی
ظہیر	امّی کا بھانجا
سعید	رشیدہ کا بھانجا
بلقیس، زبیدہ، صفیہ، سروری	بلّی اور نسیمہ کی سہیلیاں

ایک کمرہ جس میں ایک کاؤچ پڑا ہوا ہے۔ کاؤچ کے سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے۔ کمرہ کی کھڑکی کے پاس ایک الماری میں کچھ کتابیں، اُون اور ریشم وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کونہ میں میز ہے جس پر گراموفون رکھا رہتا تھا۔ مگر اب خالی پڑی تھی کمرے سے ملحق ایک ڈرائنگ روم ہے اور اس سے ملا ہوا مہمانوں کا کمرہ ہے جس میں سے ریکارڈ بجنے کی آواز آ رہی ہے — "میں کیا جانوں کیا جادو ہے، ان دو متوالے نینوں میں"

رشیدہ:۔ کوچ پر کود کر) لو آپا نسیمہ وہ . . . . وہ پھر شروع ہو گیا توبہ میرے تو کان پک گئے

نسیمہ:۔ بھئی سعید جب سے یہ ریکارڈ خرید کے لایا ہے بس اسی کے پیچھے پڑا ہوا ہے . . . جب سے یہاں آ کر ٹھہرا ہے یہ تو جیسے قید سی ہو کر رہ گئی ہوں۔ چھٹیاں کب کی ختم ہو چکیں مگر حضرت ہیں کہ ڈٹے رہتے ہیں . . . توبہ. مجھے تو سعید سودائی سا معلوم ہوتا ہے۔

رشیدہ:۔ شاعر ہیں! اگر تھوڑے سے سودائی نہ ہوئے تو دنیا کو یہ کیسے کہتے کہ وہ گران کے اشعار میں ایک قسم کا والہانہ پن ہے۔

نسیمہ:۔ بھائی یہ کچھ تمہاری سمجھی اور بیوقوفوں کا خیال ہے۔

رشیدہ:۔ کیوں؟

نسیمہ:۔ جب میں نے تم سے کہہ دیا تھا گراموفون اس کے کمرہ سے اُٹھا لاؤ تو پھر تم نے کیوں کوتاہی کی، اب بھگتو رات۔

رشیدہ:۔ اوہ! اگر ایک مرتبہ اسے اُٹھا کر لائی ہوں مگر وہ امی سے مانگ کر لے گئے، اور یہ امی اپنی عقل سے تو کچھ کرتی ہی نہیں جیسا سمجھا دو وہی کرینگی

نسیمہ:۔ خیر اگر امی کو سمجھا دیا ہوتا تو پھر وہ کیسے گراموفون دیتیں۔

رشیدہ:۔ بھئی میرے کہنے پر امی نے تو منع کر دیا مگر وہ بلّی باجی . . . بڑی لال پیلی ہوئیں اور آخر گراموفون اُٹھا کر سعید بھائی کے حوالے کر دیا تا کہ اُن کا تخیل جوش میں آئے اور مفت میں ہمارا مغز بھنے

نسیمہ:۔ دن بھر ریکارڈ، دن بھر ریکارڈ، پھر وہ بھی ایک گانا. توبہ اس بلّی کے کان لوہے کے بنے ہیں . . . . . وہ ہے بھی تو پتھر مٹھس بیٹھی ہے تو بیٹھی ہی رہے گی اور بھئی عقل تو جیسے اس کو نام کو بھی نہیں۔

رشیدہ:۔ بلّی جی سمجھتی سب کچھ ہیں مگر چونکہ ان کی طبیعت میں سادگی بہت ہے اس سے وہ نہایت عقلمندی سے اہم سے اہم بات کو ہنس کر ٹال دیتی ہیں پرسوں وہ امی کا اچھا خاصہ دوپٹہ نصیبن کی لونڈیا کو دے دیا خوب برسیں "گدھی ہے گدھی عقل تو جیسے اس کی چرنے گئی ہے۔" مگر وہ ہنستی ہی رہیں، وہ چلاتی رہیں اور وہ ہنستی رہیں۔

نسیمہ:۔ بہن رشیدہ یہ بلی بالکل کودن ہے کودن، کاٹھ کا اُلو

رشیدہ:۔ نہیں آپا آپ تو باجی کو سمجھتی نہیں۔

نسیمہ:۔ رہنے بھی دو پہلی گُن گنوانے

رشیدہ:۔ تو پھر ابا اور اماں اُن سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں۔

نسیمہ:۔ وہ تو اِن کو بچپن ہی سے بہت پیاری ہے! بچپن میں تو وہ بہت بھولی تھیں بھورے بھورے بال، کنجی آنکھیں بالکل چینی کی گڑیا معلوم ہوتی تھیں، اسی لئے تو وہ پیار میں اُسے بلّی کہنے لگے۔

رشیدہ:۔ خاک اپنی ہے اُن کی صورت، عجب رُوکھا رُوکھا سا کھرا چہرہ ہے۔ آپا تمہارا سالن میں نمک نہیں۔

نسیمہ:۔ (ہنستی ہے) اوہو رشیدہ! اوہو۔ . . یہ تمہاری تعریف کچھ لغبی چیز ہے۔ غالباً . . . غالباً تمہاری ہری مرچی ختم ہو گئی ہوگی۔

رشیدہ:۔ (چونک کر) جی نہیں۔ جی نہیں۔ . . وہ تو میں نے اشارہ کر دیا تھا اور . . . رہا مرچی کا مانگنا، وہ تو میں یوں بھی مانگ لیتی۔

نسیمہ:۔ (طنز سے، مگر ویسے میں دیتی کب!

رشیدہ:۔ (چڑ کر) آپا نے تو بس ایک بات پکڑ لی تو بس آپا آپ تو بال کی کھال نکالتی ہیں۔ (رشیدہ چلی جاتی ہے) (بلّی آتی ہے)

نسیمہ:۔ کہو بلّی کیسے کمرہ سے نکل پڑیں؟

بلّی۔ یونہی!

نسیمہ۔ شاید پرسوں جو ظہیر کی لائی ہوئی کتابوں پر پہلے تمہارا حق ہے . . . دراصل وہ کتابیں لایا بھی تمہارے لئے ہے کہنے کو تو وہ یہی کہتا ہے کہ آپا جان میں تمہارے لئے بڑی اچھی کتاب لایا ہوں!! مگر میں خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں اُس لکھنے کو وہ تو بلّی پر

بلّی:۔ آپا جان یہ آپ نے کیا بیوقت کی راگنی چھیڑ دی ——— کہئے تو میں چلی جاؤں۔

نسیمہ:۔ (قدرے زور سے، خوب خوب۔ . . . بلی میں تم کو بھی اچھی طرح سمجھتی ہوں، تم کیا ہر لڑکی اپنے منظورِ نظر کا نام آنے پر اسی طرح کی رسمی گفتگو کرتی ہے حالانکہ اُس کا دل یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے حرکات و سکنات کا جامع قسم کا ریویو سنے۔ وہ کیا کرتے ہیں، کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں! کیا نظریے ہیں، کالج میں کتنی پُرجوش تقریریں کیں، ٹینس میچ میں کیسا ہلہڑ پن ہوئے تھے، کون کونسی لڑکیاں اُن کو بنک رہی تھیں اور اچھے اسٹروکوں پر چیرز دے رہی تھیں، اور . . . اور . . . پرسوں امی سے باتیں کرتے ہوئے ان میں سے کس کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔

بلّی:۔ آپا جان آپ کی تنقید تو مٹ ہو رہی ہے۔ اُلٹے سیدھے، ہر کروٹ کیڑے نکالتی ہو۔

نسیمہ:۔ تنقید تو خیر کیا ہے! مگر ہاں تمہاری باتوں سے ظہیر کے بارے میں میرے شبہات یقین کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ میں سمجھتی تھی۔ بلّی بڑی سادہ ہے، وہ ذرا سے اُلٹ پھیر میں سب کچھ اگل دے گی، مگر تم نے تو سب کچھ اس خوش اسلوبی سے چھپا لیا۔ بالکل اُس شاطر دُردانہ کی طرح وہ جو حرفوں کی بنی ہے مگر ہماری بلّی میں اتنی عقل کہاں سے آگئی . . .

بلّی:۔ بھئی آپا میں معموں میں کب تک باتیں کرتی رہوں، میرے نزدیک تو زندگی ایک سادہ اور سلجھی ہوئی حقیقت ہے۔

نسیمہ:۔ واہ بلّی واہ . . . پوری فلسفی ہو رہی ہو، ارے بھئی یہ ہماری بلّی میں تو ایک انقلاب ہو گیا۔ بھئی رضیہ اگر تم کو ایسی فرزانگی کی باتیں کرتے سُنے گی تو وہ ضرور خیال کرنے لگے گی کہ بلّی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ وہی بیوقوف، کو دن بلّی تو ایک دن میں علامہ بن گئی۔ آنے تو دو سب کو تمہاری اچھی طرح مرمت بنے گی۔

بلّی:۔ میری اچھی آپا ایسا نہ کیجئے گا، مجھے اس شیطانی لشکر سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ذرا سی بات مل جائے رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہیں اور پھر ایسے موقع پر ان کا دماغ بھی ان کا خوب ساتھ دیتا ہے۔

نسیمہ۔ ہاں مجھے بھی تو دیکھنا ہے کہ تمہاری ان باتوں کو سن کر رضیہ کونسا فتنہ کھڑا کرتی ہے۔ لئیقہ کون سے آنے والے واقعات کی پیشنگوئی کریگی۔ بلقیس کو اس میں کونسا افادی پہلو نظر آتا ہے اور وہ مسخری زبیدہ! ابھی وہ تو ایک نئی چاشنی بھر دے گی۔

بلّی:۔ اف (گھبرا کر) زبیدہ! زبیدہ! مجھے تو اس زبیدہ سے بہت ہی ڈر لگتا ہے۔

نسیمہ:۔ ڈرنے کی کیا بات ہے وہ تو بیچاری قطعی ضرر رساں نہیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہے اس کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہے ایک وہ سردری ہے، کمبخت کو تو فزیکل کلچر کا خبط سوار رہتا ہے۔ ہر وقت مسلسل Health ڈیولپ کرنے میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے، مگر زبیدہ کا نظریۂ حیات کتنا سادہ اور آسان ہے۔ ہر لحظہ انبساط کی ایک لہر ——— اگر رنج ہو تو بھی الھڑ سی ایک ہنسی،

بلّی:۔ آپ سب زبیدہ کے فقروں سے خوب لطف اُٹھاتی ہیں۔ مگر مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میرے نشتر چبھو رہا ہو۔

نسیمہ:۔ ہٹو بی! وہ تو اچھی خاصی منسوڑ ہے۔

بلّی:۔ نہیں آپا جان آپ اس کی توہین کر رہی ہیں اس کے فقرے ہمیشہ کسی تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ . . . . وہ ہمیشہ ایک گہری طنز لئے ہوتے ہیں۔ زبیدہ نے نسوانی فطرت کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔

نسیمہ:۔ بہت جلد مرغوب ہو جاتی ہو تم وہ سب کو ہنسا دیتی ہے بس یہیں تک ٹھیک ہے۔ رہا اس کی تنقید کو سنجیدہ طور پر سمجھنا، اس کے صلاح مشورے پہ عمل پیرا ہونا۔ تو یہ اس کے نظریوں پہ کوئی عمل کرے تو یہ زندگی اچھی خاصی عذاب ہو جائے۔ کون مانتا ہے اس کی باتوں کو وہ تو پگلی ہے پگلی

بلّی:۔ نہیں نہیں آپا جان یہ آپ کی رضیہ جو بہت سنجیدہ بنی ہیں۔ اور یہ آپ کی بلقیس جن کا دعوٰی ہے کہ آج کل کے لڑکوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں سچ کہتی ہوں ایسا دھوکہ کھائینگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ قمر ایسا حلوہ نہیں، ناکوں چنے چبوائے گا۔

نسیمہ:۔ مگر بلّی یہ سب باتیں تم کیسے سمجھ لیتی ہو۔ ٹھیک ٹھیک یہ اُس قطامہ زبیدہ نے تمہارے بھیجے میں ٹھونس دیا ہوگا۔

بلّی:۔ وہ قمر! . . . رضیہ کو آئیڈیل وومن Ideal woman سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم اس میں بھی خامیاں ہیں، کمزوریاں ہیں۔ وہ اِسی دنیا کی ایک گوشت پوست والی لڑکی ہے،

نسیمہ:۔ تو پھر اس کا علاج؟

بلّی:۔ کل زبیدہ ایک گھنٹہ تک سمجھاتی رہی کہ رضیہ خدا کے لئے تم قمر کے سامنے خود کو فرشتہ صفت نہ پوز pose کیا کرو۔

نسیمہ، رضیہ نے کیا جواب دیا!

بلّی:۔ پہلے تو وہ ہنستی رہی پھر بگڑی، دیوانی، گدھی کہہ کر لان کی طرف نکل گئی۔ بیچاری زبیدہ بہت دیر تک اُداس رہی، اسے رہ رہ کر رضیہ پہ ترس آرہا تھا، سچ کہتی ہوں آپا زبیدہ کے سینہ میں ایک دردمند دل ہے۔ میں اس کی بہت قدر کرتی ہوں

نسیمہ:۔ خوب . . خوب . . . بہت سے بیوقوف مل جائیں تو پھر کیا ہے۔ اسی دنیا میں اپنے لئے ایک چھوٹی سی احمقوں کی جنت بسا لیں۔

بلّی:۔ آپا جان آپ حد درجہ جذباتی ہیں۔ (اٹھتی ہے)

نسیمہ:۔ خیر . . اچھا . . دیکھو . دیکھو تم بغیر کتاب لئے چل دیں . . . ہر مرتبہ ایک نئی چال چلتی ہو اب کتاب نہ لے کر مجھ پہ یہ واضح کرنا چاہتی ہو کہ گویا تم کو ظہیر سے کوئی دلچسپی نہیں حالانکہ .

بلّی:۔ افوہ! فوہ! . . . اچھا لائیے کہاں ہے کتاب؟

(امی آتی ہیں .

امی:۔ بلو . . . او بلو!

بلّی: جی امی!

امی:۔ وہ ہرے پھول والا راماس کا تھان تم نے دیکھا۔

بلّی:۔ جی!

امی:۔ تو اس میں سے تمہاری قمیضوں کے لئے اتروائے لیتی ہوں

بلّی، جیسی آپ کی مرضی

امی:۔ میری کیا مرضی، بچی پہننا تو تجھے ہے۔ مگر ہاں کپڑا مضبوط ہے دو چار دھوب اچھی طرح چل جائے گا۔

بلّی:۔ جی ہاں کافی مضبوط ہے

امی:۔ اری مضبوط سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کے شوق کی چیز ہو۔ ڈیزائن بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ نہ اتنا بھڑکیلا ہو جیسے بچوں کا، نہ اتنا سادہ جسے پہن کر بڑی بی معلوم ہو۔ بس درمیان ہونا چاہیئے . میرے خیال میں اس کا ڈیزائن بہت اچھا ہے۔

بلّی. جی ہاں بہت اچھا ہے

امی، اچھا تو چار گز خریدے لیتی ہوں۔ باقی پائجاموں کا پھر دیکھا جائیگا۔

(امی جاتی ہے)

بلّی:۔ (سانس بھر کر) اُف آپا جان

نسیمہ، کیا ہے بلّی؟

بلّی:۔ کیا بتاؤں آپا جان۔ مجھے یہ کپڑا جو امی خرید رہی ہیں۔ بالکل پسند نہیں بلکہ مجھے تو اس سے نفرت سی ہے۔ بکس میں رکھے ہی رکھے کیڑے کھا جائیں گے اور اگر امی نے زور دیا تو ان کا دل رکھنے کو ایک آدھ مرتبہ پہن لوں گی =

نسیمہ:۔ اوہو بلّی اب کہہ رہی ہو۔ امّی سے نہ کہا۔

بلّی:۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے امّی سے، وہ تو میرے ذہن پر اس طرح حاوی ہو چکی ہیں کہ وہ بالکل ماؤف سا ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ میری پسند پسند نہیں۔ ہر بات اپنی فطرت کے خلاف کرتی ہوں۔

نسیمہ:۔ تم خواہ مخواہ امّی کو قصوروار ٹھہرا رہی ہو۔ قصور تمہارا ہے وہ تم سے کیا کہتی ہیں۔ تم اُن کا پسند کیا ہوا پہنو۔ مگر تم تو اس قدر فرمانبردار واقع ہوئی ہو۔ تم اس قدر ڈرپوک ہو کہ تم اپنی انفرادیت قائم ہی نہیں رکھ سکتیں۔

بلّی:۔ کتنی صحیح بات کہی آپ نے آپا جان! جی میں آتا ہے منہ چوم لوں۔

نسیمہ:۔ (ہنس کر) پھر بے تکی باتیں شروع کر دیں گدھی،

بلّی:۔ سچ کہتی ہوں آپا قصور اس میں میرا ہی ہے۔

(بہت سے پیروں کی چاپ)

سب:۔ نسیمہ . . . بلّی . . . ارے کس کونہ میں گھسی بیٹھی ہو۔

بلّی: . . . (سراسیمہ ہوکر) آپا جان . . . آپا جان وہ سب آگئیں . . . توبہ توبہ ایک نیا طوفان کھڑا کر دیتی ہیں۔ ان کی نظر میں تو زندگی سٹیریا سے کم نہیں اور اتوار کا دن تو نئی جولانیوں کا ہوتا ہے۔

نسیمہ: آج تو ان کی زبانیں گز بھر کی ہو جائیں گی وہ ظہیر کے کالج کی بھی تو چھٹی ہوگی۔

بلّی:۔ (زور سے) مصیبت پر مصیبت . . . خدا کرے زبیدہ نہ آئی ہو۔ خدا کرے زبیدہ نہ آئی ہو۔ بہت نڈر ہے کمبخت، سب کچھ صاف صاف کہہ دیتی ہے۔

نسیمہ:۔ (ہنس کر) وہ ضرور آئی ہوگی۔

(سب آتی ہیں)

رضیہ:۔ اوہو بلّی! "چپ چپ سی وہ بیٹھی ہیں، آنکھوں میں نمی سی ہو"

بلقیس: "نازک ہی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے"!

(سب تالیاں بجاتی ہیں)

زبیدہ: کہو بلّی چھپ چھپ کر شکار کرتی ہوگی۔

بلّی:۔ (چلا کر) خدا کے لئے زبیدہ زبان کو قابو میں رکھو۔

زبیدہ:۔ بہت خوب! ملکۂ عالم کا حکم بجا لاؤں گی۔

بلّی:۔ (چڑ کر) توبہ توبہ اس سینما نے تو تمہارا دماغ خراب کر دیا۔ صاف صاف باتیں کیا کرو۔ آخر اس ایکٹنگ سے فائدہ۔

زبیدہ:۔ اوہو بلّی تم اس سماج میں رہ کر ایکٹنگ سے گھبراتی ہو۔ وہی غیر مہذب سادگی کی دلدادہ ہو جس میں ہر خواہش، ہر تمنا، ہر رنج، ہر خوشی جوں کی توں بیان کر دی جائے۔ زندگی کی پیچیدگیوں سے بدظن ہو۔ ارے ایکٹنگ ہی میں سوسائٹی کی نجات ہے۔

رضیہ:۔ (چلا کر) ختم کرو اس لیکچر کو!

زبیدہ:۔ (اپنی دھن میں) ہم سب ایکٹنگ کرتے ہیں۔ گھر میں، بازار میں، ایکٹنگ صرف سینما اور اسٹیج تک محدود نہیں۔ یہی وہ سوشل آرٹ ہے جس سے ہم خود کو دوسروں کی نظروں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ ہم وہ نہیں جو دوسروں کو معلوم ہوتے ہیں۔ پرسوں امّی مجو کی نوکری چھوٹنے پر زار و قطار رونے لگیں صرف ابا کو خوش کرنے کے لیے، حالانکہ اُن کو مجو سے شدید نفرت ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔

نسیمہ:۔ زبیدہ! ایسی باتیں کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ تم بیوقوف ہونے کے ساتھ ساتھ بدتہذیب بھی ہوتی جا رہی ہو۔

زبیدہ:۔ آپ کی نام نہاد تہذیب کی رو سے میں ضرور بدتہذیب ہوں . . ہاں تو بلّی! محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا سمبندھ ہماری روح سے ہے مگر آج کل کی محبت، وہی ایک ایکٹنگ، ہم خوب ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

رضیہ:۔ بھئی یہ دیوانی اگر چپ نہ ہوئی تو اُسے دھکا دے کر نکال دو۔

بلقیس: ہاں تو نسیمہ! خالہ تو ظہیر ہی کو پسند کرتی ہیں، بلّی کی نسبت اس ہی سے ہوگی۔

نسیمہ: ہاں ہاں کل کھانے پر وہ یہی تذکرہ ابا سے بھی چپکے چپکے کر رہی تھیں۔ انہوں نے بھی بہت پسند کیا اس رشتہ کو۔

سروری:۔ اوہ! آئیڈیل پیئر!

(ظہیر آتا ہے)

ظہیر:۔ ارے کیا نسیمہ دو تین ...

نسیمہ:- کون آفت!

ظہیر: وہی!

نسیمہ:- کون وہی!

ظہیر:- ارے وہی، ڈھلکے ڈھلکے پلکوں سے!! سہمے سہمے اشکوں سے!!
نیند کی ماتی آنکھوں سے!!! رنگین فسانے جاگ اُٹھے۔

نسیمہ:- اوہ! وہ سعید!

بلقیس:- اچھا وہ شاعر بے مہار!

سروری:- وہ چوہے صاحب!

نرگس:- بھئی سروری تم اُن کی ہتک کر رہی ہو۔ مسٹر ریٹ کہو ریٹ!

(سب ہنستے ہیں)

بلقیس:- بھئی یہ چوہا کس نے نام رکھا؟

سروری:- یہی ظہیر کی ایجاد ہے،

بلقیس:- بھئی ظہیر پورے آرٹسٹ معلوم ہوتے ہو۔ اس ایک لفظ سے کتنی مکمل تصویر کھینچ ڈالی، وہ اُلجھے ہوئے بال، کالی کالی سیاہ فام جلد، موٹی سی ناک پر عینک سے ٹکی ہوئی،

ظہیر: وہ ہم سے بھاگتے کیوں ہیں؟

بلقیس:- شاید ان کے جمالیاتی حس کو کوئی شاک (shock) پہنچتا ہو۔

نسیمہ:- آخر یہ اُنہوں نے بلّی سے متاثر ہو کر شعر کہنا کیوں شروع کر دیئے، اب کہتے پھریں گے کہ میری تمام شاعری کی جان ایک دوشیزہ ہے۔ اُس نے مجھے شاعر بنایا۔ میری شاعری میں تڑپ پیدا کی اور پھر کہیں گے تم جانتے ہو۔ وہ لڑکی کون ہے۔ اونہہ!! خواہ مخواہ بیچاری بلّی بدنام ہو گی۔

زبیدہ:- آخر تم سعید کو اتنا گرا ہوا کیوں سمجھتی ہو، تم لوگوں نے تو بس ظہیر کو دیکھا ہے اسی لئے سمجھتی ہو ہر سعید ظہیر ہو گا۔

ظہیر:- دیکھو آپا یہ کمبخت ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔

بلقیس:- (ڈانٹ کر) زبیدہ تمہارا بیچ نہیں۔

رضیہ:- اے کوئی جوڑ بھی ہو۔ کہاں بلّی خوبصورت پیاری پیاری آنکھیں بھورے گھنگھریالے بال، نیک، سادہ لوح، کہاں وہ سیاہ فام تنک مزاج آدم بیزار بھوت۔ بلّی کا کوئی جوڑ بھی ہو۔

(سب ہنستے ہیں)

بلقیس:- یہ آرٹسٹ ہوتے بڑے خود غرض ہیں۔

رضیہ:- ہاں ہاں ان کی نظر میں عورت ایک ماڈل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

سروری: عورت صرف محبت ہی نہیں چاہتی وہ چاہتی ہے سوسائٹی میں اس کی کوئی پوزیشن بھی ہو۔

رضیہ:- سعید کی اس وقت سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں

زبیدہ:- کون جانتا ہے بلّی سعید کے تخیل کو اس درجہ گرما دے وہ اس کے دُکھ بھرے دل میں محبت اُجاگر کر دے اور اس کے دل کے شکستہ تاروں سے ایسے لازوال نغمے پھوٹ پڑیں جو اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیں۔

بلقیس:- نتیجہ کیا ہو گا! سعید کوئی شاہکار لکھ ماریں گے اور سوسائٹی ان کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ مگر بیچاری بلّی وہ تو ایک گڑیا ہی رہے گی جس سے آرٹسٹ اپنی نجی زندگی میں کھیلتا ہے۔

زبیدہ:- بلقیس! آرٹسٹ خود غرض نہیں ہوتا۔ اگر وہ خود غرض ہو تو اُس کے آرٹ میں خلوص نہیں ہو سکتا۔ اور یہی کمی آرٹ کی بہت بڑی خامی ہوتی ہے۔

رضیہ:- (کھسیانی ہو کر) نہ جانے کیا اوں فوں بک رہی ہے

زبیدہ:- آرٹسٹ جو چاہتا ہے وہ سوچتا ہے، جو سوچتا ہے وہ کہتا ہے۔ اس کی فطرت پر ہماری تہذیب کی ملمع سازی نہیں ہوتی۔ (آہستہ سے) سچ! میں تو اس عورت کی قسمت پر رشک کروں جسے ایک آرٹسٹ نے چاہا ہو۔

بلقیس:- زبیدہ! تیری قینچی سی جیبا کب تک چلے گی؟

ظہیر:- ہاں تو کیا خالہ جان نے اُن کا پتّا کاٹ دیا۔

نسیمہ:- آج انہوں نے سعید سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم اپنے گھر چلے جاؤ۔

رضیہ:- خالہ نے یہ الٹی میٹم خوب دیا۔

بلقیس:- آخر ہماری ممانی بھی لائیں، وہ تو کہو ہم نے ان کو اُونچ نیچ سے آگاہ کر دیا ورنہ وہ تو بیٹی کی مارے بہت محبت کرتی ہیں۔

سروری :- مگر وہ ذرا سی جذباتی شے کے لئے اپنی چہیتی بیٹی کی قسمت کیسے پھوڑ دیں۔

ظہیر :- بہت کبیدہ خاطر ہونگے بیچارے۔ کاش وہ چلتے وقت الوداع کے عنوان سے کوئی نظم کہہ ڈالتے۔ . . ارے بلّی تم خاموش کیوں ہو۔ ذرا بیچارے کو تسلّی دے آئیں۔

بلّی :- (آہستہ سے) جی!

رضیہ :- بلّی تم تو اُن سے تنگ آگئی ہوگی۔

بلّی :- جی!!

بلقیس :- بیچاری بھیگی بلّی ہے کوئی اور ہوتی تو اچھی طرح خبر لیتی۔

بلّی :- (طنزیہ مسکراہٹ سے) جی! جی!!

ظہیر :- بھئی اس بلا کے دور ہونے پر نیاز دلانا۔

بلّی :- جی ضرور! ضرور!!

(رشیدہ آتی ہے)

رشیدہ :- آپا وہ سعید بھائی کا سامان بندھ گیا۔ بیچارے سعید بھائی بہت اُداس ہیں۔ سچ امّی نے بڑا ظلم کیا۔ ابھی کچھ دن اور رہ لیتے۔ مجھے تو ان کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

نسیمہ :- تو رشیدہ تم نے سفارش کر دی ہوتی۔

رشیدہ :- میں نے تو بہت کہا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔

ظہیر :- رشیدہ یہ تمہارے ہاتھ میں کالے کالے ٹکڑے کیسے ہیں؟

رشیدہ :- ریکارڈ کے ہیں!!

نسیمہ :- تم بہت ریکارڈ توڑتی ہو

رشیدہ :- یہ ـــ فلم زندگی کا ہے یہ ریکارڈ " سہگل کا گایا ہوا جو سعید بھائی کا لایا ہوا اُن کے کمرے میں ٹوٹا پڑا تھا۔

ظہیر :- چہ . . چہ . . چہ . . اتنی مایوسی! بیچاروں نے اپنا فیورٹ (Favourite) ریکارڈ توڑ ڈالا . . بھئی رشیدہ یہ ٹکڑے مجھے دو۔ یہ تو کسی میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں۔ بیچارے شاعر کے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے۔

بلّی :- (جیسے دورہ پڑ گیا ہو) ظہیر! ظہیر!! (چلّا کر) اگر زیادہ بدتمیزی کی تو میں تمہارا منہ نوچ لونگی۔

بلقیس :- یہ اسے کیا ہو گیا؟

رضیہ :- شاید ہسٹیریا کا دورہ ہے!

بلّی :- جی نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر ذلّت زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔

ظہیر :- بلّی! میں نے تمہاری کونسی ذلّت کی ہے؟

بلّی :- اتنی دیر سے ذلّت کر رہے ہو اور پوچھتے ہو میں نے کیا کیا، کتنی دیر سے تم سعید کا مذاق اڑا رہے ہو۔ اُس کی توہین میری توہین ہے۔

نسیمہ :- بلّی! دیوانی ہو گئی ہے کیا؟

بلّی :- آپا جان آج میں اپنے تمام ہمدردوں سے فیصلہ کر کے ہی چھوڑوں گی۔ آپ کو بڑی ہمدردی ہے نا بلّی سے۔ اسی لئے چپکے چپکے بغیر کچھ سمجھے آپ سب مجھے ایذا پہنچاتی رہیں۔

بلقیس :- بلّی! خدا تمہیں نیکی دے۔

بلّی :- ظہیر! مجھے تمہاری صورت سے چڑ ہے۔ میں نے اس کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ میری سہیلیوں کو دُکھ ہوگا۔ مجھے تمہارے کردار سے سخت نفرت ہے۔ میں تمہاری ٹیڑھی مانگ، سلکی سوٹ اور اُبھری ہوئی ٹائی سے کبھی متاثر نہیں ہوئی۔

رضیہ :- بہت بہک رہی ہو بلّی!

بلّی :- تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ آپا جان تک مجھے غلط سمجھتی رہیں (وہ خود ظہیر کو پسند کرتی ہیں لیکن کہتی یہی ہیں کہ میں ظہیر کو پسند کرتی ہوں)۔

نسیمہ :- (چلّا کر) بلّی!! میں تیری باتوں کا بُرا نہ مانوں گی۔ تیرا دماغ چل گیا ہے

بلّی :- میں آج وہ سب کہہ ڈالوں گی جو مجھے نہ کہنا چاہیئے تھا۔ میں اپنے ضمیر کو اب زیادہ دھوکہ نہیں دے سکتی۔

نسیمہ :- بلّی!!

بلّی :- بلّی نہیں شیرنی کہو، ادنیٰ قسم کی فرمانبرداری اور بزدلی نے میری تمام تر انفرادیت کو دبائے رکھا۔ آپا جان کو اس کا بہت گلہ ہوگا۔ کیونکہ وہ بیوقوف اور دیوانی بلّی کے مقابلہ میں بہت عقلمند اور ذہین گردانی جاتی تھیں۔

نسیمہ :- خدا کے لئے بلّی آہستہ بولو امّی نہ سن لیں۔

بلّی :- میں یہی چاہتی ہوں۔ ابا، امّی دونوں سُن لیں آپ سب نے

مل کر میرا سعید کے کمرہ میں جانا بند کروا دیا۔ مگر میں پھر بھی چوری چوری رات میں سعید سے ملتی رہی۔

بلقیس:- اُف بلّی!!

بلّی:- میں اپنے رویہ پر پانی پانی ہوئی جارہی ہوں جب ہمارا کردار نیک ہے۔ ہمارے خیالات پاک ہیں۔ ہماری روح معصوم ہے۔ پھر ہم ایک دوسرے سے ملنے میں کیوں ڈریں۔

(سعید آتا ہے)

سعید:- اچھا بلّی، آپا نسیمہ خدا حافظ!

بلّی:- سعید!

سعید:- کیا ہے؟

بلّی:- (تحکمانہ انداز سے) سعید تم آج نہ جاؤ گے۔

سعید:- نہیں نہیں بلّی! میرا سامان بندھ گیا ہے مجھے جانا ہی چاہیئے۔

بلّی:- (زور سے) میں کہہ رہی ہوں تم آج نہیں جا سکتے۔

سعید:- خالہ جان ناراض ہوں گی۔

بلّی:- خیر اگر مجھ سے زیادہ تمہیں خالہ جان کا خیال ہے تو تم بخوشی جا سکتے ہو۔

سعید:- نہیں بلّی! یہ بات نہیں!

بلّی:- تو پھر آج تم نہیں جا سکتے۔

سعید:- اچھا ... اچھا ... جیسی تمہاری مرضی!!!

(فیڈ آؤٹ)

بقیہ "طمانچہ"

جس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ جسے میں ابتدا سے ہی اس قدر غیر اہم سمجھتا آیا ہوں کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں غور کرنے کی تکلیف ہی نہیں کی۔ میرے ہی خوابوں کا تصنع کتنا انوکھا ہے۔ ان کی کھیلوں میں اختراعیں کس قدر نرالی ہیں۔ جن میں دوسروں کو اذیت پہنچا کر ہی لطف حاصل کیا جاتا ہے۔

منتشر پژمردہ پتے میرے قدموں میں انسانی ہڈیوں کی طرح کھڑکھڑا رہے تھے۔ اور میں آندھیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اس سڑک پر اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ جس میں جابجا گڑھوں کی وجہ سے ہر لحظہ لڑکھڑا کر گر پڑنے کا امکان تھا ———

مخمور جالندھری

کاغذ

سفید رنگ کا کاغذ ہے کتنا بے مصرف
مگر جب اس پہ حروف آ کے ثبت ہوتے ہیں
لگا کے رکھتے ہیں آنکھوں سے پھر یہی کاغذ ——
سجا کے رکھتے ہیں پھر اس سے طاقچے اپنے
اسی چھپے ہوئے کاغذ کا یہ کرشمہ ہے
قدم قدم پہ کئی درس گاہیں کھلتی ہیں ——

مجھے یقیں ہے جو ملتی زبان کاغذ کو
بچارا درد بھرے لہجے میں پکار اٹھتا
"مصنفین مرا صاف، مرمریں پیکر
تخیّلات سے الفاظ کی عفونت سے
سیاہ کرتے ہیں کیوں اپنے نام کی خاطر ——!

اُمیّد و بیم

جمیلؔ ملک

میرے احساس پہ چھا جاتا ہے انجامِ حیات
آکے منجدھار میں جب ناؤ میری پھنستی ہے
میری تدبیر پہ ہو جاتا ہے لرزہ طاری
اور تقدیر کنارے پہ کھڑی ہنستی ہے

بڑھتے ہیں میری طرف موت کے فولادی ہاتھ
جن سے ہوتے ہیں عزائم میرے آمادۂ جنگ
عالمِ خوف میں لیکن مجھے کشتی کے قریب
چادرِ آب پہ رقصاں نظر آتے ہیں نہنگ

سوچتا ہوں کہ یمِ دہر کی ان موجوں سے
کیا میری ناؤ بھی ٹکرا کے اُلٹ جائے گی؟
گھِر گئے، غرق ہوئے، اس میں سفینے لاکھوں
اِن تھپیڑوں سے کبھی یہ بھی نکل پائے گی؟

سوچتا ہوں مجھے طوفاں سے بچائیگا کوئی؟
میری کشتی بھی کنارے سے لگائے گا کوئی؟

ایش ٹرے

حزبُ اللہ

خشک پتّوں پہ وُہی تاباں پرسہلائیں
لہلہاتے ہوئے پھُولوں سے جو محروم رہیں

کہکشاں ٹوٹ چکی، ڈوبے ہزاروں تارے
داغِ دل، نارِ شفق لُوٹ چکی، کچھ نہ رہا

گوشت اور پوست میں محدود رہا حسنِ ازل

مرے آنسو، مری آنکھوں ہی میں تڑپنے لگ جائیں
اور میں بیکس و مجبور، کہ رو بھی نہ سکوں

مرے ارمان —— بلکتے ہوئے بھونروں کیطرح
سُوکھے تنکوں سے بھی کچھ پیاس بجھا لیتے ہیں
نرم باہوں میں ہے عفریت کا مکروہ بدن
ظلمتِ شب کو ستارے بھی مٹا دیتے ہیں
جو بھی ہو، جیسے بھی ہو—کوئی تسلّی دے دے
مرمریں طشت میں یہ راکھ ہے منظور مجھے۔

بھی اک عام فرد بن جائے۔ اور زندگی کے مدوجزر سے لطف حاصل کرے۔ اور اس طرح انسانوں سے دُور فکر کے ویرانے میں نہ کھویا رہے آخر وہ پختہ ارادہ کرلیتا ہے کہ انانیت کے اُس تنگ چوبارے سے اپنے آپ کو گرا کر اپنے "فن کار نفس" کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیگا
میں دن بھر عوام کی سی خواہشات کا ذکر کیا کرتا تھا۔ کہ شاید یوں زبانی زبانی کہنے سے مجھ میں ان خواہشات کے لئے حقیقی دلچسپی پیدا ہوجائے۔ لیکن تخیل اور انانیت کا بھوت مجھ پر اس طرح سوار تھا۔ کہ ذراسی تنہائی اور خاموشی مجھ میں اور عوام میں پھر وہی بُعد پیدا کردیتی گھر لوٹتے ہوئے راستہ میں مجھے ہر طرف ویرانے دکھائی دیتے۔ ایسا اندھیر انظر آتا۔ جو مجھے اپنی طرف راغب کرتا۔ اور کسی "انانی گناہ" کی ترغیب دلاتا۔ حتیٰ کہ انسان میری نگاہ میں کھٹکنے لگتے۔

لیکن اب ——— اب میں اس عوام کی جذباتی لذت سے متعارف ہوچکا ہوں۔ کیونکہ محبوبۂ زندگی کی لذت مجھ پر آشکارا ہوچکی ہے۔ اور میں نے آخری فیصلہ کرلیا ہے۔ کہ اس انانیت یا "فنکاری" کے اونچے چوبارے سے چھلانگ لگا کر ہجوم میں جا گروں اندیوں اپنی شخصیت کے اس "انانی" پہلو کا گلا گھونٹ دوں ——— اب میں اپنی انانیت کی دیواروں کو دوبارہ کھڑا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

آخر میں راشد نے عورت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ رنگین ہونے کے علاوہ حقیقت نواز بھی ہے۔ "روح کا اظہار" میں عورت کی عنفوان شباب کی پہلی بیداری کا بیان ہے۔ راشد کے نزدیک مرد ایک فن کار ہے جس کا عمل محبت کا اظہار ہے۔ اور سامان ایک الھڑ کنوارعورت جسے وہ اپنے عمل سے گمنامی کے غاروں سے نجات دلاتا ہے اور اس پر اس کے سحر کی قوت اور ہمہ گیری کا انکشاف کرتا ہے
مرد کا اظہار محبت درحقیقت اس کی اپنی روح کی گہرائیوں کا مظاہرہ ہے۔ جس کے بغیر روح کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

توکہ تھی اس وقت گمنامی کے غاروں میں نہاں — میرے ہونٹوں ہی نے دی تجھکو نجات

"آنکھوں کے جال" میں راشد مرد کی اس فنی تخلیق یعنی عورت کے جاگے ہوئے سحر کا عالم دکھاتا ہے۔ اور اس سحر کی انتہا بیان کرتا ہے خود فنکار اپنے تراشے ہوئے بُت کے جادو سے متاثر ہے اور اپنی فنی تخلیق کی آرزو میں مقید ہے

دیکھ وہ دیوار پر تصویر دیکھ + یہ اگر چاہے کہ اس کا آفرینندہ کبھی + اس کے ہاتھوں میں ہو مغلوب و اسیر۔
کیا ہی بے معنی ہے یہ اس کا خیال + آج لیکن میری مدہوشی کو دیکھ + میں کہ تھا خود آفرینندہ ترا۔ پابجولاں
میرے جسم روح تیرے سامنے + ساحری تیری خداوندی تری +

اور اسی نظم میں وہ ایک اور گہری حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے

تیرے ہاتھوں میں مگر لرزش ہے کیوں + کیوں ترا پیمانہ ہونٹوں سے ترے ہٹتا نہیں
خام وتو آموز ہے تو ساحرہ + کررہی ہے اپنے فن کو آشکار!

فنکار یعنی مرد اپنی فنی تخلیق (عورت) کا کمال اسی بات میں سمجھتا ہے کہ وہ اپنے آفرینندہ کو اسیر کرسکے۔ اور بظاہر اس قدر بلند و بے نیاز نظر آئے کہ مرد پر یہ راز نہ کھلے کہ وہ تصویر جو ہمارے عقل وہوش کھو دیتی ہے۔ خود ہی اس جام کی محتاج ہے جس کی مرد کو آرزو ہے۔ لیکن عورت کا سحر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کا راز فاش ہوجانے پر بھی اس کے سحر کا اثر زائل نہیں ہوتا۔

"ہونٹوں کا لمس" میں عورت کے جسم کے خاموش سحر کو کیسے لطیف مگر پرزور الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

تیرے ان ہونٹوں کے اک لمس جنوں انگیز سے + چھا گیا ہے چارسُو + چاندنی راتوں کا نور بے کراں +
کیف ومستی کا وفور جاوداں + چاندنی ہے اور میں اک "تاک" کے سایے تلے + "استادہ" ہوں +
جان دینے کے لئے آمادہ ہوں :

عورت کا لمس مرد کے لئے ایک فطری اور آفاق گیر حاجت ہے۔ عورت کے ایک ہلکے سے اشارے پر جو اثبات سپردگی بارضامندی کا شاہد ہو۔ مرد ایک اردلی کی حیثیت سے استادہ ہوجاتا ہے۔ اور جان تک دے دینے پر آمادہ بھی۔ یہاں "تاک" اور "استادہ" کے استعارے کس قدر رنگین اور دلآویز ہیں۔ جن میں فحاشی کی جھلک تک آنے نہیں پائی۔ اور یہی راشد کے بیان کا

کا کمال ہے۔
اس منبع لطف ولذت کی لازوال قوت ملاحظہ ہو۔ جس کا ایک مبہم اشارہ ہمیں چشم زدن میں بعید بلندیوں سے کھینچ کر مجاز کے عام اکھاڑے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایک ایسا اکھاڑا جہاں مُلّاں۔ فنکار، مفکر، جرنیل اور عوام سب ایک سے ہو جاتے ہیں۔
"ایک رات" میں راشد یہ واضح کرتا ہے کہ فنکار کو صرف حصول لذت کی خواہش نہیں جسمانی معانقہ صرف اس لئے قابل حصول نہیں۔ کہ اس میں جوش اور مدہوشی کی لذت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ صرف اسی سمے عورت بے نقاب ہوتی ہے۔ اور جب عورت بے نقاب ہوتی ہے تو گویا بذات خود فطرت اس کی پلکوں، ہونٹوں اور آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم فطرت کو اپنے سامنے رقصاں دیکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

تیرے دل میں ساز کی اک کائنات
سرخوش اظہار تری ہر نگاہ !
بے بسی کی نیند میں اُلجھے ہوئے
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کیلئے

تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
تیری مژگاں کے تلے گہرے خیال ؟
تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
اپنی نکہت اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے

راشد کی یہ تصاویر حقیقت اور زندگی کو اس طرح بے نقاب کرتی ہیں کہ ایک ساعت کے لئے ہم چونک اٹھتے ہیں ——— ششدر رہ جاتے ہیں۔ اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ حقیقت سی ٹھوس چیز کو بھی ایسے رنگین اور لطیف کنایوں میں بیان کرتا ہے۔ کہ وہ نقوش ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ اس کے خیال، اسالیب بیان، نقطہ نظر اور فنکاری میں ایک دل کش جادو ہے۔ اور اس کا فن ہمیں زندگی کی دلچسپیوں اور محاسن کی طرف مائل کرنے کے علاوہ ہمیں اپنی موجودہ زبوں حالی کا شعور بھی دلاتا ہے۔ اس کا تخیل اور فکر ہمارے دل میں ایک ہمہ گیر ہمدردی کی رَو پیدا کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم زندگی کو اپنے سامنے یوں عریاں اور رقصاں دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک ساعت کے لئے ہم خدا بن گئے ہوں۔ اور دُور سے زندگی کی گھما گھمی کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔

ناول

ایک رات سجاد ظہیر ۱/۴/-
خنوران غلام عباس ۱/۴/-
ٹرجنیف ۱/۴/-
جادو (مترجمہ) سراج الدین احمد (زیر طبع)
ان کے سعادت حسن منٹو (زیر طبع)
اختر حسین رائے پوری ,,
کیر عصمت چغتائی ,,
یواریں اپندر ناتھ اشک ,,
خواجہ احمد عباس ,,
اور جہنم کرشن چندر ,,
,, ,, ,,
اختر اورینوی ,,
راجندر سنگھ بیدی ,,

ڈرامے

کے ڈرامے سعادت حسن منٹو ۳/-/-
اپندر ناتھ اشک ۱/۸/-
سعادت حسن منٹو ۱/۸/-
,, ,, ,, ۱/۴/-
ورتیں اندریف ۱/۸/-
ان کی زندگی اوپندرناتھ اشک ۲/-
اھے گالزوردی (زیر طبع)
ار مہندر ناتھ ,,
ھا اور برا عصمت چغتائی ,,
طان کرشن چندر ,,
کست کے بعد راجندر سنگھ بیدی ,,
شندہ

منظومات

ات و نغمات ,, ,, ۵/-/-
رف و حکایت ,, ,, ۴/-/-
قش و نگار ,, ,, ۳/۸/-
کر و نشاط ,, ,, ۲/۸/-
جنون و حکمت ,, ,, ۴/-/-
سیف و سبو ,, ,, ۵/-/-
ماوراء ن-م- راشد ۲/۸/-
نقش فریادی فیض احمد فیض ۲/-/-
آہنگ اسرار الحق مجاز ۲/-/-
نغمہ حرم اختر شیرانی ۲/-/-
آبگینے عبدالحمید عدم ۱/۸/-
آہنگ رزم وقار انبالوی -/۱۲/-
۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں حلقہ ارباب ذوق -/۱۲/-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں (مرتبہ) ادارہ -/۱۲/-
۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں حلقہ ارباب ذوق ۱/۴/-
۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں ادارہ ۱/۴/-

خوناب اختر انصاری ۱/۸/-
میراجی کے گیت میراجی -/۱۲/-
فروزاں معین احسن جذبی ۱/۸/-
زہر خند یوسف ظفر ۲/-/-
وسعتیں سلام مچھلی شہری ۱/۸/-
شعلہ ساز فراق گورکھپوری ۵/-
بادۂ مشرق ساغر نظامی ۳/۸/-
تلخیاں ساحر لدھیانوی ۱/۱۲/-
جلال و جمال احمد ندیم قاسمی (زیر طبع)
زہراب علی جواد زیدی ,,
ساغر ساغر نظامی ,,
رنگ محل (بہ ترمیم و اضافہ) ,, ,,
سلسلہ (اردو کی بہترین غزلیں) ,,
آتشکدہ عبدالحمید عدم ,,
پرتو جان نثار اختر ,,
تاریک سیارہ اختر الایمان ,,
گھن گرج (انقلابی نظمیں)
مرتبہ گوپال متل ,,
سارنگ (گیتوں کا مجموعہ)
مرتبہ رام پرکاش اشک ,,
غزلیں حفیظ ہوشیارپوری ,,

اجتماعیات

مشین اور مزدور باری ۱/۴/-
آزادی کی راہیں برٹرینڈ رسل ۱/۸/-
راجہ اور کسان لیونارڈ ام شف -/۸/-
صاحب اور مذہب ,, ,, -/۸/-
بابو اور مزدور ,, ,, -/۸/-
سوشلزم اینگلز ۱/۴/-
سرمایہ داری عبد اللہ ملک -/۸/-
جاگیر داری ,, -/۸/-
آمریت اکرام قمر -/۸/-
Pakistan&UntouchabilityCh.Afzal Haq 2/4
پاکستان (اردو) چوھدری افضل حق ۱/۴/-
احساس کمتری شیر محمد اختر -/۸/-
مربونکی قومی تحریک: مسعود علی ندوی -/۸/-
معیشت زر ابن الحسن -/۸/-
گاندھی ازم-نیشنلزم-سوشلزم: ایم-این-رائے ۱/۸/-
سویٹ روس کے مزدور گوپال متل -/۸/-
سائنس اور دنیا ایچ-جی ویلز -/۸/-
رائے کے مضامین ایم-این رائے -/۸/-
سامراج لینن (زیر طبع)

ادبیات و تنقیدات

ادب کثیف حاجی لق لق ۱/۴/-
ھندی کے مسلمان شعراء: عبداللہ بٹ -/۸/-
اقبال اور اسکا پیغام محمد رفیق خاور -/۸/-
اردو ڈراما عبد السلام خورشید -/۸/-

کا کمال ہے۔

اس منبعِ لطف و لذت کی لازوال قوت ملاحظہ ہو۔ جس کا ایک مبہم اشارہ ہمیں چشم زدن میں بعید بلندیوں سے کھینچ کر مجاز کے عام اکھاڑے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ایک ایسا اکھاڑا جہاں مُلّاں۔ فنکار، مفکر، جرنیل اور عوام سب ایک سے ہو جاتے ہیں۔

"ایک رات" میں راشد یہ واضح کرتا ہے کہ فنکار کو صرف حصولِ لذت کی خواہش نہیں جسمانی معانقہ صرف اس لئے قابلِ حصول نہیں۔ کہ اس میں جوش اور مدہوشی کی لذت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ صرف اسی سمے عورت بے نقاب ہوتی ہے۔ اور جب عورت بے نقاب ہوتی ہے تو گویا بذاتِ خود فطرت اس کی پلکوں، ہونٹوں اور آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم فطرت کو اپنے سامنے رقصاں دیکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

تیرے دل میں ساز کی اک کائنات
سرخوشِ اظہار تری ہر نگاہ؟
بے بسی کی نیند میں اُلجھے ہوئے
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کیلئے

تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغا ئے عظیم
تیری مژگاں کے تلے گہرے خیال؟
تیرے سینے کے سمن زاروں میں اٹھیں لرزشیں
اپنی نکہت اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے

راشد کی یہ تصاویر حقیقت اور زندگی کو اس طرح بے نقاب کرتی ہیں کہ ایک ساعت کے لئے ہم چونک اٹھتے ہیں ___ ششدر رہ جاتے ہیں۔ اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ حقیقت سی ٹھوس چیز کو بھی ایسے رنگین اور لطیف کنایوں میں بیان کرتا ہے۔ کہ وہ نقوش ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ اس کے خیال، اسالیبِ بیان، نقطۂ نظر اور فنکاری میں ایک دل کش جدت ہے۔ اور اس کا فن ہمیں زندگی کی دلچسپیوں اور محاسن کی طرف مائل کرنے کے علاوہ ہمیں اپنی موجودہ زبوں حالی کا شعور بھی دلاتا ہے۔ اس کا تخیل اور فکر ہمارے دل میں ایک ہمہ گیر ہمدردی کی رَو پیدا کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم زندگی کو اپنے سامنے یوں عریاں اور رقصاں دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک ساعت کے لئے ہم خدا بن گئے ہوں۔ اور دُور سے زندگی کی گھما گھمی کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوں

ناول

کتاب	مصنف	قیمت
...ن کی ایک رات	سجاد ظہیر	1/4/-
...یرہ سخنوران	غلام عباس	1/4/-
...له	ٹرجنیف	1/4/-
...یم کا جادو	(مترجمہ) سراج الدین احمد	(زیر طبع)
...یر عنوان کے	سعادت حسن منٹو	(زیر طبع)
...دھیرا	اختر حسین رائے پوری	"
...ڑھی لکیر	عصمت چغتائی	"
...رتی دیواریں	اپندر ناتھ اشک	"
...رچم	خواجہ احمد عباس	"
...جنت اور جہنم	کرشن چندر	"
...کدہ	" "	"
کاروان	اختر اورینوی	"
...مریض	راجندر سنگھ بیدی	"

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	3/-/-
پاپی	اپندر ناتھ اشک	1/8/-
او	سعادت حسن منٹو	1/8/-
تین عورتیں	" "	1/4/-
انسان کی زندگی	اندریف	1/8/-
چرواہے	اوپندرناتھ اشک	2/-
پیکار	گالزوردی	(زیر طبع)
اچھا اور برا	مہندر ناتھ	"
شیطان	عصمت چغتائی	"
شکست کے بعد	کرشن چندر	"
رخشندہ	راجندر سنگھ بیدی	"

منظومات

کتاب	مصنف	قیمت
آیات و نغمات	" "	5/-/-
حرف و حکایت	" "	4/-/-
نقش و نگار	" "	3/8/-
فکر و نشاط	" "	2/8/-
جنون و حکمت	" "	4/-/-
سیف و سبو	" "	5/-/-
ماوراء	ن۔م۔ راشد	2/8/-
نقش فریادی	فیض احمد فیض	2/-/-
آہنگ	اسرار الحق مجاز	2/-/-
نغمۂ حرم	اختر شیرانی	2/-/-
آبگینے	عبدالحمید عدم	1/8/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	-/12/-
۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	-/12/-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں	(مرتبہ) ادارہ	-/12/-
۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں	حلقہ ارباب ذوق	1/4/-
۱۹۴۴ء کی ...		1/4/-

کتاب	مصنف	قیمت
خوناب	اختر انصاری	1/8/-
میراجی کے گیت	میراجی	-/12/-
فروزاں	معین احسن جذبی	1/8/-
زہر خند	یوسف ظفر	2/-/-
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	1/8/-
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری	5/-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	3/8/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	1/12/-
جلال و جمال	احمد ندیم قاسمی	(زیر طبع)
زہراب	علی جواد زیدی	"
ساغر	ساغر نظامی	"
رنگ محل (بہ ترمیم و اضافہ)	"	"
سلسلہ (اردو کی بہترین غزلیں)		"
آتشکدہ	عبدالحمید عدم	"
پرتو	جان نثار اختر	"
تاریک سیارہ	اخترالایمان	"
گہن گرج (انقلابی نظمیں)	مرتبہ گوپال متل	"
سارنگ (گیتوں کا مجموعہ)	مرتبہ رام پرکاش اشک	"
غزلیں	حفیظ ہوشیارپوری	"

اجتماعیات

کتاب	مصنف	قیمت
مشین اور مزدور	باری	1/4/-
آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل	1/8/-
راجہ اور کسان	لیونارڈ ڈامشف	-/8/-
صاحب اور مذہب	" "	-/8/-
بابو اور مزدور	" "	-/8/-
سوشلزم	اینگلز	1/4/-
سرمایہ داری	عبد اللہ ملک	-/8/-
جاگیر داری	"	-/8/-
امریت	اکرام قمر	-/8/-
Pakistan & Untouchability	Ch. Afzal Haq	2/4
پاکستان (اردو)	چوہدری افضل حق	1/4/-
احساس کمتری	شیر محمد اختر	-/8/-
مربوط قومی تحریک	مسعود علی ندوی	-/8/-
معیشت زر	ابن الحسن	-/8/-
گاندھی ازم۔ نیشنلزم۔ سوشلزم	ایم۔این۔رائے	1/8/-
سویٹ روس کے مزدور	گوپال متل	-/8/-
سائنس اور دنیا	ایچ۔جی ویلز	-/8/-
رائے کے مضامین	ایم۔این۔رائے	-/8/-
سامراج	لینن	(زیر طبع)

ادبیات و تنقیدات

کتاب	مصنف	قیمت
ادب کثیف	حاجی لق لق	1/4/-
ہندی کے مسلمان شعراء	عبداللہ بٹ	-/8/-
اقبال اور اسکا پیغام	محمد رفیق خاور	-/8/-
اردو ڈراما	عبدالسلام خورشید	-/8/-

اردو میں اشتراکی لٹریچر

(باری صاحب کی نئی کتابیں)

کارل مارکس

"کمپنی کی حکومت" کا مصنف اس کتاب میں نئے دور کے بہت بڑے مفکر کارل مارکس کے معاشی، تاریخی اور فلسفیاتی نظریوں کو آسان اور عام فہم ہندوستانی میں پیش کرتا ھے۔ عمرانی علوم میں کارل مارکس نے نئے نظریے پیش کر کے ان علوم میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ کتاب ان انقلابی تصورات کو پیش کرتی ھے۔　ایک روپیہ چار آنے

مشین اور مزدور

کیا مشینوں کا وجود انسانوں کے لئے مفید ھے یا مضر؟ اس سوال کا جواب "مشین اور مزدور" میں دیکھیں۔ اس کتاب میں انگلستان، روس اور ہندوستان کی مزدور تحریک کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔　ایک روپیہ چار آنے

سوشلزم

سوشلزم کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لئے کارل مارکس کے عمر بھر کے ساتھی فریڈرک اینگلز کی یہ کتاب بہت زیادہ اہمیت رکھتی ھے۔ اس کتاب نے سوشلزم کو خیالی دنیا سے نکال کر سائنسی علوم کے دائرے میں داخل کر دیا۔　ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ اردو لاہور

مطبوعہ ریپن پریس، لاہور